رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ
حیاتِ وارث
حصہ سوم
مصنف جناب مرزا محمد ابراہیم بیگ صاحب شیدا وارثی لکھنوی

سببِ امتناعِ سجادگی لیکن سرسری طور پر دیکھنے والے کو یہ معلوم ہوگا کہ یہ امتناع جانشینی کا فرمان بھی شاید حضور قبلۂ عالم کا اجتہاد ہوگا۔ کیونکہ سلاسل مشائخین عظام میں خلافت و جانشینی کا دستور عام ہے۔

مگر نہیں یہ ہماری محدود معلومات کا قصور ہے۔ وسیع النظر شخص کو یہ شبہ کبھی نہ ہوگا بلکہ تھوڑا غور کرنے سے عوام الناس پر یہ ظاہر ہوسکتا ہے کہ درحقیقت یہ حکم بالکل اصول طریقت کے مطابق ہے اور اکثر ممتاز عارفین نے خلافت اور جانشینی کو غیر ضروری سمجھا ہے۔

لہٰذا میرے خیال میں اس مسئلہ کی صحت اور عدم صحت کو معلوم کرنے کے لئے آسان طریقہ یہ ہے کہ پہلے معتبر اور مستند کتابوں میں انصاف کی عینک سے یہ دیکھنا چاہیئے کہ حضرات عارفین میں وہ جلیل المنزلت اور مقدس ہستیاں جن کے نورانی جسم پر تصوف کا گراں قدر خرقہ موزوں ہوا۔ اور جو درحقیقت صوفی تھے۔ اور جن کو آج بھی دنیا کے محققین صحیح معنی میں صوفی جانتے ہیں اور جن کی نسبت اس کا بھی تصفیہ ہوچکا ہو کہ یہ برسرِ حق تھے اور ان کے جملہ اقوال اور افعال حق اور رضائے حق کے واسطے تھے انھوں نے خلافت اور جانشینی کی نسبت کیا عمل کیا اور وہ موحدین ہم خیال تھے یا اس معاملہ میں مختلف الرائے۔

ان صفاتِ حمیدہ سے موصوف بزرگوں کے اقوال اور افعال پر محاکمہ کرنے کی فرمائش اس واسطے کی گئی کہ جو خداشناس ایسے جامع الاخلاق ہوں گے ان کے حرکات و سکنات عادات و معاملات بھی ضرور قابلِ تمسک ہوں گے اور ان کی جانب نہ اغلاط کا شک نہ اغراض کا شبہ ہوگا بلکہ تیقن ہوگا کہ جو انھوں نے کہا وہ بجا کہا اور جو کیا وہ درست کیا۔

اسی کے ساتھ بہ نظرِ تعمق یہ دیکھنا چاہیئے کہ انھیں کبیر الشان عارفین نے اپنے مسترشدین میں سے کسی کو خلیفہ اور کسی کو جانشین بنانا کیوں اور کس ضرورت سے تجویز کیا اور خلفا اور جانشینوں کے سپرد کیا خدمت فرمائی۔

چنانچہ تاریخ کی ورق گردانی کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ حضرات صوفیہ جو امامِ وقت

اور صاحب مقامات علیہ تھے انھوں نے خلافت اور سجادگی کو عموماً ہدایت خلق کا سلسلہ
قایم رکھنے کے واسطے لازمی گردانا۔ اور وہ مقتدر عارفین جن کا مسلک صرف عشق الہی سے
وابستہ تھا انھوں نے مسلک کے لحاظ سے جانشینی کو بے ضرورت سمجھا لیکن دونوں کا یہ فعل مشتمل
بہ حقانیت تھا۔ اس لئے اس کے نتیجہ پر خیال کر کے ایک نے دوسرے پر اعتراض بھی نہیں کیا۔
لیکن یہ خیال کہ ہر دو فریق میں بہتر اور مفید بلکہ لائق تقلید کس کا فعل تھا اس کے تصفیہ
کی جسارت کرنا صریح منافی ادب ہے اس لئے کہ ہر دو فریق ہمارے لئے واجب التعظیم ہیں۔ اور
دونوں نے جو کیا وہ رضائے حق کے واسطے کیا۔ کیونکہ جن بزرگوں نے اپنا خلیفہ اور جانشین
مقرر کیا انھوں نے عنداللہ وہ کام کیا جس کے لئے وہ مامور تھے اور جنہوں نے اپنا خلیفہ اور
جانشین کسی کو نہیں بنایا۔ انھوں نے اپنے صدق وخلوص کا اظہار کیا کہ خدا کی محبت میں
خدا کی مخلوق کو مغالطہ کے نقصان سے بچایا کیونکہ ان کا مشرب خلافت کا محتاج نہ تھا۔
لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس اجمال کی اگر تھوڑی وضاحت اور ہو جائے اور اس
نزاع لفظی کی تفصیل کر دی جائے کہ جانشینی کی ترتیب میں حضرات صوفیہ کی کیا مصلحت تھی
اور عاشقان الٰہی نے جو سجادگی کو غیر ضروری متصور فرمایا تو فی الحقیقت ان کا نقطۂ نظر کیا تھا۔
اس کا انکشاف ہو جانے سے فائدہ یہ ہوگا کہ آج ذہنی تفریق اور فرضی اختلاف کی جو
در پردہ خراب شکل نظر آتی ہے بجائے اس مکروہ خیال کے حضرات عارفین وعاشقین کے
حقیقی اتحاد کی خوشنما تصویر ہماری آنکھیں بے نقاب دیکھیں گی۔ اس لئے اگر کہا جائے کہ یہ
بیان ہنوز تشریح کا محتاج ہے تو بے محل نہ ہوگا۔
لہٰذا ایسے تصفیہ شدہ اسباب جو ہر دو خیالات کے صحیح ترجمان ہیں اور جن کا ذکر مستند
کتابوں میں باعظمت رہنماؤں نے کیا ہے اور عقلاً ونقلاً روایت سے بھی اور درائت سے
بھی آج تک یہی ثابت ہوا ہے کہ اصطلاح صوفیہ میں منصب ہدایت کے استخلاف کا نام خلافت
ہے یا اس کو یوں کہا جائے کہ اپنی جانب سے اپنے علم کی اشاعت اور اپنے سلسلہ کی تنظیم کے

واسطے جس کو جائز مختار کیا جائے اس کو عرف عام میں خلیفہ کہتے ہیں اور اس مرتبہ کا دستیاب ہونا مرشد کی عنایت پر موقوف ہے۔

اور یہ عہدہ اس لئے قائم کیا گیا ہے کہ وہ برگزیدۂ حق ہادی جو خلق کی ہدایت کے واسطے من جانب اللہ مامور ہوتے ہیں۔ ان کا یہ بھی فرض لازمی ہے کہ اپنے بعد کے لئے مخلوق کی رہنمائی کا انتظام کریں اس لئے وہ اپنے شاگرد رشید کو خلیفہ اور جانشین بناتے ہیں اور یہ جلیل القدر مرتبہ عہد سلف صالحین سے اسی طرح منتقل ہوتا رہتا ہے اور ہمیشہ اس کا سلسلہ جاری رہے گا۔

اور تصانیف حضرات صوفیہ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہادیان راہِ طریقت ہمیشہ سے منصب خلافت اپنے اس مرید کو مرحمت فرماتے ہیں جو کما حقہ اس کا اہل ہوتا ہے کہ سلسلہ کے مشائخین عظام نے جو سلوک اور جو قاعدے طالبین کی کامیابی کے واسطے تجویز فرمائے ان کی تعلیم اسی عنوان سے دوسروں کو دے جس طریقہ سے خود اس کو اس کے پیشوائے برحق نے تعلیم دی تھی اور طالبانِ راہ حق کو اپنے فیضان باطنی سے بھی اسی طرح مستفیض فرمائے۔ جس طرح خود اس کو مرشد کامل نے فائز المرام کیا ہے۔

چنانچہ آج تک اس کا عملدرآمد اسی طریق مقررہ پر ہو رہا ہے اور امید ہے کہ ہمیشہ ہوتا رہے گا اور پیران طریقت کے تصرف باطنی سے اس مستحسن منصب میں یہ اثر ہے کہ ہادی برحق نے جس کو خلافت کا اعزاز یا سجادگی کا امتیاز تفویض فرمایا۔ اس نے اپنے دوران عہد میں مقتدار کے علم ظاہری اور باطنی کی اشاعت و ہدایت میں کبھی دریغ نہیں کیا۔ ہمیشہ بندگان خدا کو۔ خدا کے ملنے کا راستہ بتایا۔ اور اس مبلغ کی اس بے غرض خدمت کو دیکھ کر خلق نے بھی اس کی اطاعت کے آگے گردنیں جھکا دیں۔

اور اس ممتاز عہدہ کی شان و رفعت کا اس جہت سے خاص و عام کو اعتراف ہے کہ بڑے بڑے خدا رسیدہ صوفیوں نے پہلے اسی عہدۂ تبلیغ و ہدایت کا کام کیا۔ اور مخلوق الٰہی کو خدا کی رضامندی کی تعلیم دی اور یہ خدمت ایسے صدق و خلوص سے فرمائی کہ مبدا فیاض نے

ان کو دنیا کا مخدوم بنا دیا۔ اور آج تک ان کی عظمت جلالت کا چار دانگ عالم میں نقارہ بج رہا ہے۔
اس مصلحت سے حضرات مشائخین عظام نے خلافت اور سجادگی کی حمایت فرمائی اور اس ممتاز منصب کی تعمیری بنیاد اپنے مقدس ہاتھوں سے رکھی اور خدا کے فضل سے ان کی یہ عمارت آج تک قایم ہے۔ اور انشاء اللہ قایم رہے گی۔ اور ان کی یہ تنظیم ہر پہلو سے مفید ثابت ہوئی اور واقعی مفید ہے بھی۔ کیونکہ بغیر اس نظام کے نہ مشربی تعلیم کی اشاعت ہو سکتی تھی اور نہ سلسلہ کی بقا کا کوئی اور طریقہ تھا۔ اس لئے اگر یہ عرض کردوں تو بے جا نہ ہوگا کہ ان کی اس کامیاب دور اندیشی نے خانوادہ کے انتشار کو ہمیشہ کے لئے برقرار رکھا۔

لیکن مشائخین عظام کے اس مشربی نظام سے بالکل برعکس اور جداگانہ حضرات عاشقین کا مسلک ہے حالانکہ نظر غائر سے دیکھا جائے تو جملہ مقربین بارگاہ احدیت کے شائستہ خیال کا نتیجہ اور مآل واحد ہے مگر بظاہر ہر گلے را رنگ وبوئے دیگرست" کا مضمون ہے کہ جس طرح شاہد بے نیاز کی رضامندی کا صحیح راستہ بنانے کے لئے جملہ سلاسل صوفیہ کے ارباب حل وعقد نے تعلیم و تربیت کے دستور العمل میں تقرر خلافت اور جانشینی کو لازمات سے گردانا ہے اسی طرح عاشقان حضرت احدیت۔ خدا کے بندوں کو خدا سے ملانے اور کثرت میں اس کی شان وحدت کا کرشمہ دکھانے کے واسطے وسیلہ خلافت اور ذریعہ جانشینی کو فعل عبث اور بیکار سمجھتے ہیں۔ بلکہ مسبب الاسباب کی قوت کاملہ کے آگے ہر سبب کو لاشے اور ہر ترتیب و تنظیم کو ممنوع اور منافی مشرب عشق جانتے ہیں۔

مگر واضح رہے کہ عاشقین سے میرا روئے سخن ان عاشقان ذی مرتبت کی جانب ہے جو اپنے اختیار کو اس قادر مطلق کے آگے فنا کر کے اس کی تجلی نور کے مشاہدہ کے لئے ہمہ وقت بصد عجز و نیاز سرنگوں رہتے ہیں۔ اور جن کا سرمایہ دارین۔ صرف عشق الٰہی ہو۔

کیونکہ طبقہ عشاق باعتبار اپنے مشربی خیال و مذاق کے دو نوع پر منقسم ہے اور دونوں کے اصول متضاد ہیں۔ چنانچہ طبقہ اولیٰ جن کو عاشقان خاص یا عاشقان صادق یا عاشقان

کامل کہہ سکتے ہیں یہ جاں نثار بجز یار کے کسی سے سروکار نہیں رکھتے۔ عشق ہی ان کا مذہب عشق ہی ان کا مشرب ہوتا ہے عشق ہی سے واسطہ عشق سے ان کو مطلب ہے عشق ان کا دین عشق ہی ایمان عشق ہی ان کی روح عشق ہی جان۔ عشق ہی کے ظل حمایت میں نکی نشو و نما ہوتی ہے۔ عشق ہی پر ان کی حیات و ممات کا مدار ہے ہمہ وقت عشق ہی کا دم بھرتے اور زبان حال سے کہتے ہیں ؎

مرحبا اے عشق خوش سودائے ما　　اے طبیب جملہ علتہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموس ما　　اے تو افلاطون و جالینوس ما

اور طبقہ ثانی جن کو عرف صوفیہ میں نسبتاً عشاق کہتے ہیں ان کا مستقل اصول یہ ہے کہ اپنے مذہبی اور مشربی شرائط و ضوابط کی پوری تعمیل اور کامل پابندی کے ساتھ خرمن عشق کے خوشہ چین ہیں۔ یا اس کو یوں کہا جائے کہ اس کے عقائد اور اعمال کی تعمیری بنیاد گو قواعد مذہبی اور صحائف مشربی پر ہے مگر کاشانۂ ملت کے نقش و نگار۔ کارزما عشق کو جانتے ہیں اس لئے ان کا یہ تصدیق قلب اقرار باللسان یہ ہے کہ وہی عبادت مفید عابد۔ اور مقبول معبود ہوتی ہے۔ جو مشتمل بر عشق و محبت ہو۔

اور اس طبقہ ثانی کا یہ قابل تعمیل اور ممکن العمل اصول ایسا ہر دل عزیز اور مقبول عام ثابت ہوا کہ دنیا کے ہر مذہب اور ہر ملت کے رہنماؤں نے اس کی تقلید پسند فرمائی اور اپنے اپنے سلسلہ کے دستور العمل کی پیشانی پر جلی قلم اور سرخ روشنائی سے یہ لکھدیا کہ پوجا۔ پاٹ، جپ، جاپ، دھیان، گیان، اطاعت، عبادت، ریاضت۔ مجاہدت، جد وجہد سیر و سلوک۔ تجرید۔ تفرید کے قواعد مقررہ اور ضوابط معینہ پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ عشق کا بھی دامن پکڑو کیونکہ مقبولیتِ اعمال محبت پر موقوف ہے۔

اور یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ ہر مذہب و ملت کے سالکین راہ حق اپنے اپنے اصول کے مطابق جب سیر سلوک سے فارغ اور فائز المرام ہوتے ہیں تو سرکار رب العزت سے

بہ لحاظ ان کے مدارج و مراتب ان کو خطابات تفویض ہوتے ہیں جن کے مفہوم سے ان کی رفعت و عظمت کا بھی اظہار ہوتا ہے اور انکے مذہب و ملت کا بھی اشارہ ہوتا ہے۔

لیکن باوجود جملہ افاضات و انادات کے اس طبقہ کو سرکار شاہد غیبی سے کبھی عاشق کا خطاب نہیں تفویض ہوا۔ جس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان کی ریاضت اور عبادت ضمناً عشق و محبت سے وابستہ ضرور ہوتی ہے۔ مگر ان کا اصول مشرب کلیتہً عشق سے ماخوذ نہیں، اور یہ کلیہ ہے کہ جز کو کل پر فضل نہیں ہوتا اس لئے باعتبار ان کے اصول کلی کے ان کو خطابات ملتے ہیں۔ اور بہ لحاظ محبت جو مشرب کا ایک جز و ہے۔ عاشق کا خطاب نہیں ملتا۔

اس مختصر تصریح سے بخوبی ظاہر ہو گیا کہ عاشقان کامل کی تعریف انھیں ممتاز عاشقین پر صادق آتی ہے جن کے معاملات مشرب کلیتہً عشق سے ماخوذ ہوں اور خیالات سبب و اسباب کے تکدرات سے پاک اور کائنات میں انکو صرف ایک ذات سے ایسا گہرا تعلق ہو جس میں نہ دوئی کی گنجائش ہو اور نہ خودی کا وجود رہے۔

عشق تعلیم خلق سے بے نیاز ہے اب قابل لحاظ یہ امر ہے کہ جس مشرب کو نہ کسی ضابطہ کی قید نہ قاعدہ سے واسطہ، نہ تعلیم و تعلم سے سروکار نہ ترتیب و تنظیم سے تعلق ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی مسلمہ ہے کہ اس کی ہدایت و اشاعت کا اختیار رب العزت کے دست قدرت میں ہے۔ تو اس مشرب کے علمبردار کو اپنا خلیفہ اور جانشین بنانے کی کیا ضرورت ہے۔

قطع نظر اس کے حقیقت عشق کی نسبت صوفیائے متقدمین نے بالاتفاق فرمایا ہے کہ عشق اسرار الٰہی میں سے ایک مخصوص راز ہے جس کی حقیقت کا علم۔ عالم علم مَا کَانَ وَمَا یَکُوْن کے علم میں محفوظ اور مستتر ہے بفحوائے لَا یَعْلَمُ اِلَّا ھُوْ۔ بقول مولانا علیہ الرحمتہ عشق اصطرلاب اسرار خداست۔

پس جب کہ عشق کی حقیقت اور ماہیت دریافت کرنے میں ہمارا فہم وادراک قاصر ہے۔ بلکہ عشق کی صحیح تعریف بھی ہم نہیں کرسکتے۔ بقول۔

در نگنجد عشق در گفت و شنید　　عشق دریا ئیست قعرش ناپدید

تاہم باوجودیکہ ہماری عقل مجبور اور علم مجہول ہے مگر یہ جسارت کہ دوسروں کو عشق کی تعلیم دیں اور مشرب عشق کا دستور العمل بنائیں۔ اور اپنے بعد کے واسطے اس کا انتظام کریں کہ عشق کا انصاب قایم اور تعلیم جاری ہے۔ قطعاً عقل و انصاف سے بعید معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ عشق کی تعلیم و تربیت پروردگار عالم نے بندوں کے سپرد نہیں فرمائی ہے بلکہ عشق کا عطا کنندہ اور عشق کا معلم حقیقی خود عشق کا خالق مطلق ہے۔ اسی خیال سے عاشقان صادق نے خلافت اور سجادگی کو منافی مشرب عشق گردانا ہے اور اسی کلیہ کے اعتبار سے ہمارے حضور قبلہ عالم نے مسترشدین سے متواتر فرمایا۔ بلکہ اعلان کر دیا کہ ہماری منزل عشق ہے جو کوئی دعویٰ جانشینی کا کرے وہ باطل ہے ہمارے یہاں کوئی ہر چمار ہو یا خاکروب۔ جو ہم سے محبت کرے وہ ہمارا ہے"

خلاصہ یہ کہ عشق بہت بڑا مرتبہ ہے۔ چنانچہ اصطلاح صوفیہ میں عشق اس مقام کو کہتے ہیں جو غایت رفعت عارفین اور نہایت قرب مقربین ہے۔ بقول۔

عجب راہیست راہ عشق ہیہات　　کہ چرخ ہفتمش ہفتم زمین است

اور یہ مرتبۂ علیا ہمیشہ مخصوص مقبولین حق کو منجانب حق تفویض ہوتا ہے چنانچہ حضور قبلہ عالم نے بھی اسی مضمون کو دوسرے الفاظ میں یوں فرمایا ہے کہ "عاشق کم اور مشایخ زیادہ ہوتے ہیں۔ اور باوجودیکہ آپ کے مزاج کی نشست یہ تھی کہ ذاتی فضل و کمال کا اظہار نہیں فرماتے تھے۔ مگر یہ بار بار ارشاد ہوا ہے کہ "ہماری منزل عشق ہے" جو آپ کے حالات و واقعات سے بخوبی ثابت ہو چکا ہے کہ آپ کا قلب منور عشق حقیقی کے جذبات سے معمور تھا۔ اور آپ کا چھیاسی سالہ طرز معاشرت زبان حال سے باواز بلند کہہ رہا ہے کہ دنیا میں صدیوں کے بعد ایسے حامل رضا و تسلیم عاشق کا ظہور ہوتا ہے اور اسی مناسبت کی آپنے امتناع سجادگی کا حکم صادر فرمایا جو بہ لحاظ مشرب بالکل صحیح اور درست ہے۔

علاوہ اس کے حصول عشق درس و تدریس، تعلیم و تربیت پر موصوف نہیں کیونکہ یہ باطنی کیفیت اور قلبی واردات ہے جو منجانب اللہ نصیب ہوتی ہے۔ جیسا کہ سرکار عالم پناہ نے متواتر فرمایا ہے کہ "عشق وہی ہے جو کسب سے حاصل نہیں ہوتا"۔ اور یہ مسئلہ جملہ حضرات صوفیہ کا تسلیم کردہ ہے کہ عشق موہبت محض ہے۔ اور سب نے لکھا ہے کہ "اِنَّمَا ھِیَ مِنْ مَوَاھِبِ الْحَقِّ وَفَضْلِہٖ" چنانچہ مولانا علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں۔

گرچہ آں عاشقاں بخارا میرود   نہ بدرس و نے بہ اوستا میرود

عاشقاں را شد مدرس حسن دوست   دفتر و درس سبق شاں روئے اوست

آں طرف کہ عشق می افزود درد   بوحنیفہؒ شافعیؒ درسے نکرد

پس حقیقت یہ ہے کہ عشق عنایت وہبی ہے اور جد و جہد کوشش اور کسب سے حاصل نہیں ہوتا۔ بقول حافظ شیرازی علیہ الرحمتہ۔

می خور کہ عاشقی نہ بہ کسب است و اختیار   ایں موہبت رسید ز دیوان قسمتم

اور اسی وجہ سے حصول عشق کے لئے ظاہری تعلیم نہیں اور جب ظاہری تعلیم نہیں ہے تو پھر نہ خلافت کی ضرورت ہے نہ سجادگی کی حاجت اسی واسطے حضور قبلۂ عالم نے علی الاعلان فرمایا کہ "ہماری منزل عشق ہے جو کوئی دعویٰ جانشینی کا کرے وہ باطل ہے"

قطع نظر اس کے صحیح معنی میں خلافت یا سجادگی تعلیم و تربیت کے انتظام کا نام ہے۔ کہ حضرات صوفیہ آیندہ نسلوں کو فیض پہنچانے کی غرض سے یہ انصرام فرماتے ہیں کہ جانشین یعنی اپنے سلسلہ کا منتظم تعلیم اس کو کرتے ہیں جو ان کے علم و مسلک کا عالم اور فارغ التحصیل ہوتا ہے لیکن "ملت عشق از ہمہ دینہا جدا است" عشق میں انتظام نہیں۔ اور نہ کوئی علم وصول عشق میں معین ہوتا ہے۔ کیونکہ علم کو عقل سے سروکار ہے اور حضرت عشق کی تشریف آوری سے پہلے عقل مفرور ہو جاتی ہے جیسا کہ منقولات قدیمہ سے ثابت ہے اور خود حضور قبلۂ عالم نے بھی فرمایا ہے کہ "جہاں حضرت عشق آئے پھر وہاں علم و عقل کا دخل نہیں" اور مولانا علیہ الرحمتہ

فرماتے ہیں:

صبح آمد شمع او بیچارہ شد — عشق آمد عقل او آوارہ شد

سایہ را با آفتاب او چہ تاب — عشق سایہ حق بود حق آفتاب

جب کہ ثابت ہے کہ عشق کی عملداری میں عقل و علم کا دخل نہیں اور انتظام عقل کا فعل ہے جس سے عاشق کو تعلق نہیں تو پھر عاشق صادق اس کا نظم کیونکر کرسکتا ہے کہ آیندہ کے لئے اپنا جانشین بنائے جو اقتضائے عشق کے صریح خلاف ہے اس وجہ سے وہ عاشقان جانباز جن کا سرمایہ فخر و ناز صرف عشق تھا اور جو بجز نظارہ جمال شاہد حقیقی جمیع مرادات سے دست بردار تھے ان کا اس مشرب خاص میں کوئی جانشین نہیں ہوا۔

مثلاً صاحب تصدیق و یقین مخدوم حضرت شرف الدین بو علی شاہ قلندر تارک کامل قدس سرہٗ العزیز جو پروانہ وار شمع جمال ایزدی پر شیفتہ اور سطوت جلال فردانیت خداوندی پر فریفتہ محو تجلیات انوار ماسوا ریار تمام عالم سے بے سروکار تھے جن کے فیض و تصرف سے زمانہ واقف ہے لیکن ممدوح الصفات کا مشرب قلندری یعنی تعلیم عشق حقیقی کے لئے کوئی جانشین نہیں ہوا۔ جس کا سبب یہی ہے کہ طریق عشق میں نہ تعلیم و تربیت کی حاجت نہ انتظام و انصرام کی ضرورت، نہ عبارت و اشارت سے حقیقت عشق کا اظہار ہوسکتا ہے اور نہ حصول عشق کے لئے جدوجہد درکار ہے۔ بقول حافظ شیراز علیہ الرحمۃ۔

قلم را آں زباں نبود کہ سر عشق گوید باز — ورائے حد تقریر است شرح آرزومندی

دل اندر زلف لیلیٰ بند و کار عشق مجنوں کن — کہ عاشق را زیاں دارد مقالات خردمندی

بلکہ یہ واردات قلبی خاص ودیعت الٰہی اور عین عنایت وہبی ہے جو نہ تعلیم و تربیت پر موقوف نہ واسطہ اور وسیلہ کی محتاج ہے۔ فیضان عشق و محبت۔ عاشقان کامل کی توجہ باطنی پر منحصر ہے۔ اور ان کے جوش قلبی کی صحیح نسبت۔ طالبین کے دلوں کو گداز اور مائل بہ محبت کرتی ہے اور ان کا فیض و تصرف اپنے وابستہ کو اس کی حالت اور استعداد کے لحاظ سے

اسے بغیر کسی ظاہری تعلیم کے مستفیض کرتا ہے اور اسی افاضہ کو اصطلاح صوفیہ میں نفخہ روحی بھی کہتے ہیں۔ اور یہ تصرف مثل عہد ظاہری کے ان کے وصال کے بعد بھی قائم رہتا ہے
جس کی دوسری مثال یہ ہے کہ تاج الموحدین، سلطان العاشقین حضرت بایزید بسطامی علیہ الرحمۃ جن کا نام نامی طبقۂ عشاق میں خصوصیت کے ساتھ مشہور ہے آپ نے بھی طریق عشق میں تعلیم ظاہری کے لئے کسی کو اپنا جانشین نہیں تجویز فرمایا بلکہ جس طرح آپ کے زمانہ میں آپ کے فیضان باطنی سے مسترشدین کو افاضہ ہوا۔ اسی طرح آپ کے مزار پرانوار سے طالبان صادق مستفیض اور فائز المرام ہوئے۔
جیساکہ صاحب مراۃ الاسرار اور مصنف تذکرۃ اولیا نے لکھا ہے کہ حضرت شیخ ابوالحسن خرقانی علیہ الرحمۃ آپ کے وصال کے ایک صدی بعد پیدا ہوئے۔ اور آپ کے فیضان باطنی سے مستفیض ہوئے۔
بلکہ یہ قصہ دیگر حضرات صوفیہ نے بھی اپنی تصنیفات میں بصراحت نقل کیا ہے لیکن بہ نظر احتیاط اس واقعہ کو اس مستند کتاب سے نقل کرتا ہوں جس کی صحت کے واسطے حضرت ملا جامی علیہ الرحمۃ کا یہ فرمانا کافی ہے کہ "ہست قرآن در زبان پہلوی" اور ارباب طریقت کے ساتھ علمائے شریعت نے بھی بالاتفاق اقرار کیا ہے یعنی حضرت مولانا روم علیہ الرحمۃ اس واقعہ کو دفتر چہارم میں تسطیر فرماتے ہیں۔

از پس آں سالہا آمد پدید	بوالحسن بعد از وفات بایزید
ہمچناں آمد کہ او فرمودہ بود	بوالحسن از مرداں آنرا شنود
کہ حسن باشد مرید و اُمتم	درس گیرد ہر صباح از تُربتم
ہر صباحی آید و خواند سبق	بر سر خاک وشود پیر بحق
ہر صباح تیز رفتے بے فتور	بر سر گورش نشستی با حضور
ہر صباح رو نہادی سوئے گور	ایستادہ تاضحیٰ اندر حضور

تامثال شیخ پیش آمدے　　　تاکہ بے گفتن شکالش حل شدے

علیٰ ہذا حسین بن منصور حلاج علیہ الرحمۃ جن کے پراسرار کلام ابوالقاسم نصرآبادی نے نقل کئے ہیں اور محقق اور صاحب حال کہا ہے اور ابوالعباس بن عطا محمد بن حنیف کا قول ہے کہ حسین بن منصور ربانی عالم تھے اور یہ تو معروف عام ہے کہ اس عارف حق نے پروانہ وار شمع جلال حضرت احدیت پر جان فدا کر کے عشق کی آخری منزل طے فرمائی مگر اس برگزیدہ خدا کے طریق خاص کی تعلیم و تربیت کے لئے کوئی جانشین نہیں ہوا۔ اور یہ بھی مسلمہ ہے کہ جسطرح آپ کی حیات ظاہری میں آپ کے برکات اور تصرفات سے مخلوق الٰہی مستفید ہوئی اسی طرح بعد وصال شاہد حقیقی بھی آپ کے فیضان باطنی کا چشمہ جاری رہا۔ چنانچہ منقول ہے کہ حضرت فریدالدین عطار علیہ الرحمۃ۔ عہد منصور سے ایک سو پچاس سال بعد پیدا ہوئے اور آپ کی روحانیت سے ان کو افاضہ حاصل ہوا۔

اس سے زیادہ عجیب اور مصدقہ دور رسالت کے عاشق صادق حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قصہ ہے جن کے عشق کامل کے لئے کسی صراحت کی ضرورت نہیں۔ زمانہ جانتا ہے کہ آپ نے جذبات عشق کے جوش میں اپنی ہستی اور لوازمات ہستی کو ایسا فراموش کیا کہ بجز خیال یار کسی سے سروکار نہ رہا۔ مگر طریق عشق کی تعلیم ظاہری کے لئے آپ کا بھی کوئی جانشین نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ نہ آپ کی ارادت کے واسطے آج تک کوئی ظاہری انتظام ہوا اور نہ اس کے مشرب کے لئے کسی زبانی تعلیم و تلقین کی ضرورت۔ جس طرح نادیدۂ جمال محبوب ذوالجلال پردہ شیفتہ ہوئے۔ اسی طرح بے دیکھے ان کے فیضان باطنی سے طالب خدا مستفیض ہوتے ہیں۔ تیرہ سو برس سے آپ کا یہ تصرف جاری ہے اور ہمیشہ انشاءاللہ جاری رہے گا۔ جس کا سبب یہی ہے کہ بقول سرکار عالم پناہ ”عشق میں انتظام نہیں“ اور چونکہ کارساز مطلق تعلیم کنندہ ہے اس لئے جو ہو رہا ہے وہ ہوتا رہے گا۔

الغرض انہیں چند تمثیلات سے بخوبی ظاہر ہو گیا کہ نہایت جلیل القدر اور غایت

ممتاز عاشقین ہے جن کی رفعت و عظمت ۔ تبحر و تقدس کا زمانہ معترف ہے ۔ مشرب عشق
کی تعلیم و تربیت کے واسطے کسی ظاہری تنظیم کی ضرورت متصور نہیں فرمائی ۔ بلکہ جس عنوان
سے عنایت وہبی نے ان کو اختصاص تقرب تفویض فرمایا تھا اسی صورت سے ۔ بغیر کسی واسطے
اور وسیلے کے ان کے فیضان باطنی سے طالب خدا مستفیض ہوئے اور ہوتے ہیں اور ہوں گے
اور چونکہ مشرب عشق انتظام ظاہری سے قطعاً معرا ہے ۔ اس واسطے بہ لحاظ اتمام حجت ۔ ہمارے
جناب حضرت نے متواتر فرمایا اور بکمال اہتمام اعلان کر دیا کہ ہمارا مشرب عشق ہے جو کوئی
دعویٰ جانشینی کا کرے وہ باطل ہے ۔

اور بفرض محال اگر کسی وقت میں کوئی عاشق جمال ایزدی بہ نظر افادہ اپنے مسترشدین
کے حق میں زیادہ نہیں چند ہی قواعد وہ بھی حصول عشق کے لئے نہیں بلکہ شائستگی عادات
اور روزمرہ کی گفت و شنید کے واسطے بطور دستور العمل یہی ایک مضمون قلمبند فرمایا تا کہ
آداب عشق و عاشقی یہ ہیں ۔ اور شاہد بے نیاز کی جناب میں اس انداز سے استدعا کرنی چاہیئے ۔
کہ الفاظ بالمعنی بھی عجز آمیز اور بظاہر مشتمل بہ انکسار اور نہ آداب حضرت احدیت کے خلاف ہوں ۔
تو قرینہ یہ کہتا ہے کہ وہ اجتہادی فرمان نفاذ کے ساتھ ہی بے ضرورت اور بے کار
ثابت ہوتا ۔

کیونکہ عشاق سے بمقتضائے اثرات عشق کسی ایک مستقل نظام کی پابندی محالات
سے ہے ۔ اس واسطے کہ اصولاً عاشق کی لسم اللہ ایسے اسباب سے ہوتی ہے جو تغیرات کے جامع
اور تبدلات کے مجموعہ ہیں ۔

چنانچہ ایک سبب منجملہ ان اسباب کے یہ بھی ہے کہ حقیقت عشق کی نسبت لفظائیت
ارباب طریقت میں یہی منقول ہے کہ مصطلحات صوفیہ میں عاشق کی اس کیفیت کو عشق اور
محبت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں جو مطالعۂ جمال یار کے واسطے قلب کو مضطرب اور بے قرار
کر دے ۔

اور اس میں بھی کسی کو اختلاف نہیں ہے کہ عشاق کی اس وہبی حالت اور قلبی کیفیت کا وجود مشاہدۂ انوار حضرت احدیت کے اثرات سے ہوتا ہے اور یہ بھی مسلمہ ہے کہ تجلی انوار رب العزت کی شان ہر ساعت اور ہر آن جدا گانہ ہوتی ہے بمصداق کُلَّ یَوۡمٍ ھُوَ فِیۡ شَاۡنٍ۔

اور چونکہ تجلی انوار شاہد حقیقی کی شان ہر مرتبہ بشکل جدید ظہور پذیر ہوتی ہے اس لئے اس کے برکات بھی مختلف ہوتے ہیں اور اثرات بھی جدا گانہ اور ان اثرات سے متاثر ہو کر قلب عاشق کی حالت اور کیفیت بھی یکساں نہیں رہتی بلکہ حسب مناسبت واردات قلبی کبھی سلوک، کبھی سکوت، کبھی جمعیت کبھی انتظار، کبھی آداب محبوب کا پورا خیال، کبھی بیخود اور مغلوب الحال غرض گاہے چنیں گاہے چناں کا مضمون ہوتا ہے کیونکہ ہر حالت کا جو اقتضا ہوتا ہے اس کے آثار عاشق کے حرکات و سکنات سے ظاہر ہوا کرتے ہیں۔

پس جبکہ قلبی کیفیات میں ہر وقت غیر معمولی تغیرات ہوا کرتے ہیں تو اس انقلابی حالت میں کسی مستقل قاعدہ کی یکساں تعلیم کیوں کر ہو سکتی ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ عشاق کی واردات قلبی میں بھی بقدر استعداد تفریق ہو۔ لہذا گو بامعنی جملہ عاشقین کے خیالات کا مال ایک ہی کیوں نہ ہو مگر بظاہر رفتار، گفتار، طرز، طریقہ، افعال، اقوال ایسے متضاد ہوتے ہیں کہ بعض کے اکثر عادات۔ ارشادات۔ حدود آداب معینہ سے باہر نظر آتے ہیں لیکن یہ اختلاف چونکہ ان کے انتشار و اضطرار کا نتیجہ ہوتا ہے اس لئے ان کی ظاہری تقریر کو خطا و تقصیر سے منسوب کرنا ہماری صریح نادانی ہے بقول حافظؒ۔

گفتگوئے عاشقاں در کار رب ۔۔۔۔ جوشش عشق است نے ترک ادب

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست ۔۔۔۔ سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجا است

اسی لحاظ سے شاہد حقیقی جو عالم غیب اور ناظر حال ہے۔ ہمیشہ اپنے عشاق کے حرکات و سکنات کی ان کے ذوق و شوق، حالات و کیفیت کے اعتبار سے ان کو ایسی گرانقدر جزا دیتا ہے۔ بظاہر جس کے وہ سزاوار نہیں معلوم ہوتے۔

چنانچہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ بڑے بڑے شائستہ خیال اور خجستہ خصال عشاق جن کے عادات نہایت مہذب اور خیالات غایت مؤدب تھے جن امتیاز کے ساتھ بارگاہِ رب العزت میں اختصاص تقرب سے وہ سرفراز ہوئے اسی شان سے وہ آوارگانِ محبت جو سراپا وارفتہ اور از خود رفتہ تھے اور جن کی شوق آمیز تقریر گو نیازمندانہ لہجہ میں سہی مگر حدودِ آداب سے یقیناً متجاوز تھی لیکن مبدا رفیاض کی عنایت سے ان کا بھی مقربین میں شمار ہوا اس کا سبب خاص یہی ہو سکتا ہے کہ اس بندہ نواز نے دردمندانِ محبت کا اجر وصلہ ان کے صفائے باطنی پر موقوف فرمایا ہے۔

اور اگر اس غیر معمولی انعام و عنایت خداوندی کا صحیح مطالعہ اور وسیع معائنہ کرنا منظور رہو تو یہ بھی دشوار نہیں۔ ایک طرف دلدادۂ شاہد مدنی حضرت اویس قرنی کی ممتاز شخصیت کو کتب سیر کی وساطت سے بہ نگاہ تامل دیکھا جائے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس برگزیدۂ الٰہی کی مقدس ہستی جامع صفات اور مجموعہ کمالات تھی اور یہ واقعہ ہے کہ جس استقلال سے اس سیاح وادی عشق نے وصال شاہد بے نیاز کے شوق میں صبر و ثبات سے کام لیا اسی اہتمام سے اس حق پرست و حق شناس نے اپنے فرائض منصبی کی نگہداشت فرمائی اور جس طرح آپ کے ذات اقدس عابدوں میں فرد اور زاہدوں میں یگانہ تھی اسی طرح آپ کے خیالات بے حد شائستہ اور آداب عشق و عاشقی سے کماحقہ و البتہ تھے اور یہ بھی کہنا شاید بے جا نہ ہوگا کہ انھیں صفات حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ کی جہت سے آپ کو نہایت نہایات اور غایت غایات تقرب الٰہی کا مرتبہ تفویض ہوا۔

اور دوسری جانب اگر عہد موسوی کے اس آشفتہ حال وارستہ خیال مشتاق دیدار یار مجموعہ اضطراب و اضطرار کے وفور شوق و افراط ذوق سے معمور تقریر کو جو سراپا عجز و نیاز کی تصویر ہے نگاہ غور سے دیکھتے ہیں تو بظاہر اس مرد میدان عشق و عاشقی کی منطق جدا گانہ فلسفہ کچھ اور نظر آتا ہے جس کا ذکر مولانا علیہ الرحمۃ نے بھی اپنی مثنوی میں بکمال صراحت کیا ہے حالانکہ قصہ

زبان زد خلائق ہے۔ لیکن اختصار کے ساتھ اگر میں بھی اس پر درد کہانی کا اعادہ کروں تو کچھ زیادہ بے محل نہ ہوگا۔

چنانچہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ جنگل میں ایک آوارۂ دشت محبت رنجور درد الفت کسی گہرے خیال میں مصروف بیٹھا ہے مگر اشتیاق دید میں یہ استغراق ہے کہ نہ تن کی فکر نہ جان کا ہوش، یاد دلدار سے ہم آغوش، صدمات فرقت سے بے قرار، شوق وصال میں اشکبار، محو نظارۂ جمال، وفور اشتیاق میں یہ حال ہے کہ زندگی سے بیزار، مرنے پر تیار، بار ہستی سے سبکدوش، بادۂ فنا سے مدہوش، نہ بیوفائی کا گلہ، نہ کج ادائی کی شکایت، نہ اپنا قصہ نہ اپنی حکایت۔ بمقتضائے محبت اطاعت الٰہی کا دم بھرتا ہے اور بہ ہزار عجز و انکسار اپنی راحت اور عافیت کے اسباب بحضور شاہد غیور ایثار کر رہا ہے۔ اور زبان حال سے عرض گزار ہے جیسا کہ مداح الصفات حضرت مولانا کہتے ہیں

دید موسیٰ یک شبانے را براہ کو ہمی گفت اے خدا و اے الٰہ
تو کجائی تا شوم من چاکرت چارقت دوزم کنم شانہ سرت
اے خدائے من فدایت جان من جملہ فرزندان و خان و مان من
جامہ ات دوزم شپشہایت کشم شیر پیشت آورم اے محتشم
ور ترا بیماری آید بہ پیش من ترا غمخوار باشم ہمچو خویش
دستکت بوسم بمالم پایکت وقت خواب آید بروبم جائکت
گر بہ بینم خانہ ات را من دوام روغن و شیرت بیارم صبح و شام
ہم پنیر و نانہائے روغنیں خمرہا و جغرہائے نازنیں

حضرت کلیم اللہ نے اس مغلوب الحال کی حقیقت پر دھیان نہیں فرمایا۔ بلکہ اس کی ظاہری قیل و قال کی جانب متوجہ ہوئے اور چونکہ حامل علم رسالت اور ناظم نظم ہدایت تھے اس واسطے فوراً آداب عبد و معبود سے خبردار کیا۔ اور اس دیوانۂ کوئے محبت کو راز فرزانگی

دکھائی یعنی صفاتِ وحدانیت کی تبلیغ فرمائی

گفت موسیٰ ہائے خیرہ سرشدی — خود مسلماں ناشدہ کافر شدی

ایں چہ ژاژ است و چہ کفر اے نابکار — پنبہ اندر دہاں خود فشار

چارق و پاتابہ لائق مر تراست — آفتابے را چنیہا کے سزاست

گر نہ بندی زیں سخن تو خلق را — آتشے آید بسوزد خلق را

گر ہمیں دانی کہ یزداں داورست — ژاژ و گستاخی ترا چوں باورست

شیر او نوشد کہ در نشو و نماست — چارق او پوشد کہ او محتاج پاست

دست و پا در حق ما آسائش است — در حق پاکی حق آلائش است

لم یلد لم یولد او را لائق است — والد و مولود را او خالق است

موسیٰ علیہ السلام نے اس عاشق حضرت احدیت و پروانہ شمع ربوبیت کو سخت اور درشت الفاظ کے ساتھ جو تنبیہہ فرمائی تو آپ کی نصیحت سے اس دلفگار کو دردانی اذیت ہوئی۔ پیغمبر اولوالعزم کو دیکھ کر خاموش تو ہوا۔ مگر صحرائے پرخطر میں یہ کہکر روپوش ہوگیا۔

گفت اے موسیٰ دہانم دوختی — وز پشیمانی تو جانم سوختی

جامہ را بدرید و آہے کرد تفت — سر نہاد اندر بیابان و برفت

ادھر یہ خستہ حال نادم و پشیمان ہوا اور اس کی نیاز آمیز اور محبت خیز تقریر موقوف ہوئی ادھر شاہد حقیقی نے اپنے عاشق جانباز کی یہ دلداری فرمائی۔

وحی آمد سوئے موسیٰ از خدا — بندۂ ما را ز من کردی جدا

تو برائے وصل کردن آمدی — یا برائے فصل کردن آمدی

تا توانی پا منہ اندر فراق — ابغض الاشیاء عندی الطلاق

ہر کسے را سیرتے بنہادہ ام — ہر کسے را اصطلاحے دادہ ام

در حق او مدح در حق تو ذم — در حق او شہد در حق تو سم

در حقِ او نور و در حقِ تو نار — در حقِ او ورد و در حقِ تو خار

در حقِ او نیک در حقِ تو بد — در حقِ او خوب در حقِ تو رد

ما بری از پاک و ناپاکی ہمہ — وز گراں جانی و چالاکی ہمہ

من نکردم خلق تا سودے کنم — بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم

ہندیاں را اصطلاحِ ہند مدح — سندیاں را اصطلاحِ سند مدح

ما بروں را ننگریم و قال را — ما دروں را بنگریم و حال را

آتشے از عشق در جاں بر فروز — سر بسر فکر و عبارت را بسوز

موسیا آدابِ داناں دیگر اند — سوختہ جان و رواناں دیگر اند

عاشقاں را ہر نفس سوزیدنیست — بر دہِ ویراں خراج و عشر نیست

گر خطا گوید ورا خاطی مگو — گر شود پر خون شہید او را مشو

خونِ شہیداں را از آب اولی ترست — ایں خطا از صد ثواب اولی ترست

ملتِ عشق از ہمہ دینہا جداست — عاشقاں را مذہب و ملت خداست

الغرض عاشقِ کامل حضرت اویس قرنی کے شائستہ خیال اور پاکیزہ احوال کا تقابل اس شبانِ صحرانشین کی بے محل اور غیر مربوط گفتگو سے کرتے ہیں تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے اور بظاہر اس خارج الادب تقریر کی وہی تعذیر مناسب معلوم ہوتی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تجویز فرمائی تھی کہ "خود مسلمان ناشدہ کافر شدی"۔

مگر اس فراق رسیدہ کی چونکہ نسبت صحیح اور پختہ خیال تھا اس لحاظ سے شاہدِ بے نیاز نے جو عنایت اپنے مودب دل گرفتہ کی خستہ حالت پر فرمائی اس شفقت سے اپنے شعور سوز اور حواس باختہ جان نثار کا معاون و مددگار ہو کر حضرت کلیم اللہ سے فرمایا "بندۂ ما را ز من کردی جدا"

احکم الحاکمین کے اس کریمانہ فیصلہ سے صاف ظاہر ہو گیا کہ شاہدِ غیبی کی ذات تفضیل

تقلیل۔ اشارات و عبارات سے پاک و معرا ہے اس اعتبار سے عشق و محبت کی شکایت و حکایت میں مودب اور غیر مودب عشاق کا فرق وامتیاز نہیں بلکہ ان کے جوش و خروش ذوق و شوق صدق و خلوص کا اعزاز و احترام ان کے حسن باطن پر موقوف ہے جس کی قدر و قیمت کا اندازہ وہ دانائے راز فرماتا ہے جس کے ارشاد کا مفہوم مولانائے روم نے بہ تحریر فرمایا ہے کہ

ما بروں را ننگریم و قال را ما درون را بنگریم و حال را

خلاصہ یہ کہ دور رسالت موسوی کے اس عاشق جانباز کا یہ تذکرہ جو سراپا مشتمل بہ عجز و نیاز ہے اس لحاظ سے تمثیلاً نقل کیا کہ عشق و محبت کے ظاہری رموز و نکات سے بھی اگر گونہ آگاہی ہو جائے تو اس کا تصفیہ بآسانی ہو سکتا ہے کہ بخلاف سنت مشائخین جلیل القدر اور کبیر الشان حضرات عاشقین نے حسب صورت مروجہ خلیفہ اور جانشین بنانے سے کیوں قطعاً احتراز فرمایا چنانچہ الحمد للہ علیٰ احسانہ اس کا اظہار نہایت مستند اور مستحسن عنوان سے ہوگیا۔ اور اس کے اسباب نظر آنے لگے جیسا کہ ایک سبب منجملہ دیگر اسباب کے یہ بھی ہے کہ واردات قلبی کے متعدد اشکال کے مختلف اثرات سے چونکہ عاشقین کی حالت و کیفیت میں کافی تفریق ہوتی ہے اور ان کا متحد الحال نہ ہونا اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض عشاق باوجود وصل و فراق اور وفور شوق ہمیشہ ساکت اور خاموش رہتے ہیں اور بعض سرمست عہد الست عالم وجد اور حالت جوش میں ایسے الفاظ بہ تکرار فرماتے ہیں جن کا ظاہری مضمون و مقصود کلیتہً حدود و آداب عبد و معبود سے باہر نظر آتا ہے۔

اب قابل غور یہ امر ہے کہ طبقۂ عشاق کے افراد جب کہ مسلمہ طور پر نہ حال میں متحد، نہ خیال میں مساوی نہ ذوق و شوق میں ہم پایہ نہ دید و یافت میں یکساں ہوتے ہیں۔ بلکہ طریق طلب بھی ان کا تفریق سے خالی نہیں۔ پس ایسے غیر منتظم گروہ کے واسطے کوئی دستور تنظیمی کیونکر مفید اور کارآمد ہو سکتا ہے اور اس مختلف الحال جماعت کا ایک تنفر بالاستقلال قائم ہونا عقلاً محال

نظر آتا ہے اور نقلاً بھی دشوار۔ کیونکہ حضرات صوفیہ کے اقوال شاہد ہیں کہ عشق میں انتظام نہیں
اس حکایت سے یہ بھی یقین کامل ہوگیا کہ عاشق جانباز خلق کی تعلیم لفظی اور تربیت
شخصی سے قطعی بے نیاز ہیں۔ کیونکہ ان کا تعلیم کنندہ واہب العطایا ہے اس لئے کہ
مولانا علیہ الرحمۃ کا یہ ارشاد پیش نظر ہے کہ حضرت کلیم اللہ نے جو خدا کے مقرب اور برگزیدہ
رسول اور خلق کے اولوالعزم ہادی تھے۔ ایک چرواہے کو بکمال وضاحت آداب حضرت
احدیت کی ہدایت فرمائی اور بظاہر وہ تعلیم یقیناً قابل تسلیم بھی تھی مگر غیر مفید اس وجہ سے
ثابت ہوئی کہ وہ شبان صحرائی گرویدہ انوار جمال الٰہی تھا ملہم غیب نے عدم کامیابی کے
سبب سے بھی اپنے کلیم کو آگاہ کردیا کہ "موسیا آداب داناں دیگر اند" اے موسیٰ یہ
مشتاق دید اپنی خواہشات اور مرادات کو فنا اور معلومات و معقولات کو ہماری یاد میں
فراموش کرچکا ہے۔ تم ارباب عقل و ہوش کے رہنما ضرور ہو مگر اس دیوانہ کوئے محبت
کی تربیت تم نہیں کرسکتے۔ کیونکہ اس کے معلم حقیقی ہم ہیں۔

پس ذرا خیال کیجئے کہ ایسے ممتاز اور رفیع المرتبت اور صاحب کتاب پیغمبر جو وَکَلَّمَ اللّٰہُ مُوسیٰ تَکْلِیْمًا
کے معزز خطاب سے سرفراز تھے ان کا روحانی علم اور ان کی وسیع معلومات ایک دیوانہ کوئے محبت
کی ہدایت کیواسطے مفید نہ ثابت ہوئی۔ تو خرمن علم رسالت کے خوشہ چین اور در خوشہ چین کی
تادیب و تربیت سے پرستاران بارگاہ عشق کب متاثر ہوسکتے ہیں اسی واسطے عاشقین نے
اپنے سلسلہ کے مسترشدین کی تعلیم کے لئے کسی کو اپنا جانشین نہیں بنایا۔ اور اسی وجہ سے
ہمارے حضور قبلۂ عالم نے متواتر فرمایا کہ "مشرب عشق میں خلافت اور جانشینی نہیں ہے"

حضرت مولانا علیہ الرحمۃ کی اس مسطورہ حکایت کے مطالعہ سے وہ حضرات بھی سبق
آموز ہونا چاہیں تو ہوسکتے ہیں۔ جن کو سجادگی کے ساتھ گہرا انہماک ہے اور جانشینی کی حمایت
میں بے ساختہ فرماتے ہیں کہ خلافت اور سجادگی اسلام کا ایک رکن اعظم ہے حتیٰ کہ بعض حضرات
اس دلیل سے خلافت مشائخین کو سنت الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں کہ حضرت ابوالبشر آدم علیہ السلام

خلیفۃ اللہ تھے۔ اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً۔

اور یہ تو مشائخین عظام کے وابستگان کا عام خیال ہے کہ سلاسل صوفیائے متقدمین میں جب کہ لازمات سے ہے کہ ہر عہد میں سب کے جانشین ہوئے اور ہوتے ہیں۔ تو کیا سبب ہے کہ مشرب عشق کے ارباب حل و عقد نے اس کی تقلید نہیں کی اور خلاف دستور جمہور یہ طریقہ اختیار کیا کہ اپنے سلسلے میں باب خلافت و سجادگی مسدود کر دیا۔

پس یہ تخیلات اگرچہ بمنزلہ اوہام و وساوس ہی کیوں نہ ہوں مگر ان کے ابتدائی حصول کی صحت کا اقرار بھی کر لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے جیسا کہ ہم کو اس کا اعتراف ہے کہ سلاسل مشائخین عظام بجائے خود للہیت و حقانیت سے معمور ہیں تو بھی یہ اصرار کہ عاشقان جانباز حضرات صوفیائے ذی اعزاز کی مسئلہ سجادگی میں تقلید کیوں نہیں کرتے نظر غائر سے دیکھا جائے تو صریح بے محل ہے اس لئے کہ دنیا میں کوئی مشرب ایسا نظر نہیں آتا جو دیگر مذاہب کے خیالات سے کلیتہً متحد ہو حتیٰ کہ خود سلاسل مشائخین کے قواعد مسلک میں باہم مکمل اتحاد نہیں۔ بلکہ بعض مسائل میں تو ایسا گہرا اختلاف ہے جس کا عقائد و اعمال پر بڑا اثر پڑتا ہے۔

حالانکہ یہ مثال بھی مشرب کے مکمل گرویدہ کے مقابلہ میں زیادہ موزوں نہیں ہے کیونکہ جملہ سلاسل کے مذاق مسلک میں گو کافی تفریق ہے پھر بھی یہ مناسبت ہے کہ ایک سلسلہ کا حلقہ بگوش دوسرے خانوادہ کا ارادتمند ہو کر دونوں سلسلوں کے مختلف المفہوم ضوابط کی ساتھ ساتھ تعمیل کر سکتا ہے۔

لیکن مشرب عشق میں اس کی بھی گنجائش نہیں جس کو مولانا علیہ الرحمۃ نے صاف الفاظ میں لکھ دیا ہے کہ "ملت عشق از ہمہ دینہا جداست"، اور پھر یہ بھی فرمایا ہے کہ اس مشرب خاص کا اصول یہ ہے کہ "عاشقاں را مذہب و ملت خداست"، پس جو مشرب جملہ ملل و ادیان سے اپنی شان اور خصوصیت میں جدا ہو اور جس کے متبعین کا مذہب صرف خدا ہو وہ ظاہری تعلیم و تربیت سے کیونکر نہ بے نیاز ہو۔ اور جب کہ ظاہری تعلیم کی حاجت نہیں تو ظاہری

تعلیم کنندہ کی بھی ضرورت نہیں۔ اسی جہت سے مشرب عشق میں خلافت اور جانشینی کچھ نہیں۔
مختصر یہ کہ اس حکایت کی بیت آخر سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس طرح عاشقوں کا معلم
حقیقی عالم علم مَا کَانَ وَمَا یَکُوْنُ ہے۔ اسی طرح ان طالبانِ الٰہی کا دین و مذہب
بھی صرف وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ ہے اس لحاظ سے اگر مشرب عشق کو اپنی شان اور نوعیت
میں فرد اور یگانہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔

بعض اخوان ملت کے خیالات

اسی سلسلہ میں یہ بھی عرض کروں گا کہ اکثر اخوان ملت نے سجادگی کی حمایت بھی فرمائی ہے مگر ان کا کیا خیال تھا اور کس
نیت سے انھوں نے خلاف مشرب یہ طریقہ اختیار کیا اس کی حقیقت کو خدا بہتر جانتا ہے
لیکن بظاہر اس اختلاف کے یہی چند اسباب ہو سکتے ہیں کہ یا تو ان برادران طریقت کو حضور
قبلۂ عالم کے اس حکم عام اور قطعی کا علم نہیں ہوا کہ " منزل عشق میں جانشینی نہیں ہوتی"
یا ہوا بھی ہو تو وہ اس کی اہمیت سے بے خبر تھے کہ سرکار عالم پناہ نے یہ فرمان بکمال اہتمام نافذ
فرمایا ہے یا ان غلامان وارثی کو بہ صراحت معلوم نہ تھا کہ بڑے بڑے عاشقانِ ماسلف
نے بھی خلافت اور سجادگی کو غیر ضروری متصور فرمایا ہے۔ یا شاید بہ لحاظ عدم واقفیت
یہ مغالطہ ہوا ہو کہ اس ارشاد وارثی کو خبر واحد سمجھ کر متاثر نہیں ہوئے اور جمہور صوفیائے
کرام کی سنت جاریہ کو ترجیح دی یا بعض ہستیاں ایسی بھی ہوں گی کہ انھوں نے کسی
اثر سے مرعوب ہو کر اس حکم کی تعلیم میں دانستہ کوتاہی کی یا اکثر عوام الناس کے محدود
خیالات کی بنا پر اپنی قلت معلومات کی وجہ سے مشرب عشق کی اس ممتاز اور غیر معمولی خصوصیت
پر غور نہ کر سکے یا بعض خود غرضوں نے حصول مقصد کے لئے سجادہ پرستی کو مفید سمجھا خیالِ بخیہ
یہ خیال اسلئے بھی قرین قیاس ہو کہ اکثر حضرات کا یہ طریقہ دیکھا کہ چند روز اتباع سجادگی کے بعد علانیہ حکم امتناعِ سجادگی پر عمل پیرا ہو گئے۔
بہر کیف کسی وجہ سے کیوں نہ ہو مگر واقعہ یہ ہے کہ پیشوائے برحق کے وصال کے بعد ایک گروہ
نے سید محمد ابراہیم صاحب کو آستانۂ اقدس کا منتظم بنایا۔ مابعد بصورت ظاہر

ان کی اتباع اس عنوان سے کی جو سجادہ نشین کے شایان شان ہے جن میں بعض حضرات کی گرد یدگی دائرۂ عقل کے اندر یوں تھی کہ انھوں نے صرف نسبت خاندانی کا لحاظ کیا جس کو ایک طور پر اقتضائے ارادت بھی کہہ سکتے ہیں اور بعض اشخاص ایسے سنجیدہ خیال تھے کہ ان کے عادات و معاملات مصلحت سے خالی نہ تھے کہ انھوں نے ارادت مرشد کو یوں قائم رکھا کہ اپنے قدیم خدمات کا آستانۂ اقدس کے ہر دربات سے الحاق کر دیا اور ضمناً سجادگی کی بھی رسمی تعظیم کو جائز رکھا۔

مؤلف جلوۂ وارث کے خیالات کی تنقید

لیکن ہمارے خواجہ تاش حکیم صفدر علی صاحب نے جن کو بارگاہِ وارثی کی قدیم بلکہ خاندانی غلامی کا شرف حاصل ہے اور سرکار عالم پناہ کے فرمانِ جانشینی سے بھی خبردار ہونے کا آپ کو پورا اقرار ہے مگر سجادہ پرستی کے جوش میں مرشد برحق کے اس حکم عام اور قطعی کو انھوں نے ایسے غیر مربوط تاویلات کی بنا پر ناقابل تعمیل ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ بلکہ اس بحث میں ایک مستقل کتاب موسومہ بہ جلوۂ وارث تالیف فرما کر شایع کرا دی۔

آپ کا یہ رسالہ جس میں صدق ارادت کا بھی اظہار کیا ہے ۲۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ کاغذ اچھا۔ کتابت بری نہیں۔ طباعت بھی دیدہ زیب ہے لیکن مطالعہ کرنے سے بلحاظ سیاق تحریر اور ترتیب مضامین اور تنظیم واقعات اور آپ کے برجستہ کلام منظوم کو دیکھنے سے یہی انکشاف ہوتا ہے کہ مولف موصوف کے ذخیرۂ تالیفات میں یہ کتاب نقش اول کی صفت رکھتی ہے۔

اور مولف موصوف کی اس تالیف میں باعتبار کثرت مضامین یہ خاص صنعت ہے کہ اگر از بائے بسم اللہ تا تائے تمت لغور تامل بھی پڑھا جائے تو بھی اس کا تصفیہ کرنا دشوار ہے کہ اس کتاب کا موضوع کیا ہے۔

لیکن بمقابلہ دیگر مضامین کے زیادہ واضح اور بصراحت خلافت اور جانشینی کا

کا ذکر ہے جس کو لائق مولف نے بہ استدلال ثابت کرنے میں بلیغ کوشش فرمائی ہے۔ اس اعتبار سے میرا بھی یہ خیال ہے کہ اس کتاب کی اور خوبیوں کا تذکرہ نہ کروں بلکہ صرف سجادگی کی بحث میں موصوف نے جو خامہ فرسائی کی ہے اس کو بے نقاب کر دوں تاکہ ظاہر ہو جائے کہ ممدوح نے حمایت سجادگی کے انہماک میں اپنے رہنمائے کامل کے حکم قطعی کی تاویل و تردید میں کہاں تک ایمان اور انصاف سے کام لیا ہے۔

چنانچہ مولف موصوف نے بصورت مناظرہ استدلال کے ساتھ وجود خلافت کا قدیم اور مستحسن ہونا بحوالۂ تاریخ اور بہ تطبیق آیات قرآنی ثابت کرنے میں جو بسیط تقریر فرمائی ہے اور وہی دلائل جن کا ذکر پہلے کیا ہے۔ ہر دس بیس صفحات کے بعد پھر انھیں کا اعادہ فرمایا ہے اس لئے ایک ہی مضمون سے قریب قریب کتاب کا بڑا حصہ معمور ہے مگر درحقیقت جملہ استدلال کا مفہوم واحد ہے اور کم سے کم کتاب کی ایک ثلث عبارت کا خلاصہ اسی قدر ہے کہ خلافت ایسی لازمی اور ضروری چیز ہے جس کا سنگ بنیاد پہلے احکم الحاکمین نے اپنے دستِ قدرت سے نصب فرمایا اور ابوالبشر آدم علیہ السلام کو اپنا خلیفہ بنایا۔ بفحوائے "اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً"

اور اسی سنت الٰہی کی تقلید میں آدم علیہ السلام نے شیث علیہ السلام کو اپنا خلیفہ کیا۔ اور علیٰ ہذا یہ مستحسن طریقہ اسی صورت سے ہر عہد اور قرن میں جاری رہا۔ اور دیگر انبیاء و مرسلین علیہم السلام نے اپنے اپنے وقت میں اس کی تعمیل فرمائی اور اس جلیل القدر عہدے کے لائق جس کو مناسب متصور فرمایا اس کو اپنا قائم مقام کیا۔

اور چونکہ اس طریقہ کو سنت الٰہی اور سنت انبیاء ہونے کا شرف حاصل تھا اس واسطے حضرات صوفیائے کرام نے بھی خلافت اور جانشینی کو لازمی گردانا جس کا آج تک سلاسل مشائخین میں عملدرآمد بدستور ہوتا ہے۔

بالآخر لائق مولف نے اپنے اس مطول بحث کا نتیجہ یہ نکالا ہے کہ یہ طریقہ چونکہ صالحین

اور صادقین کا ہے اور اس کی ابتدا حضرت احدیت نے فرمائی ہے اس لئے جناب حاجی صاحب قبلہ کا یہ ارشاد کہ "منزل عشق میں خلافت اور جانشینی نہیں ہوتی" قابل تعمیل نہیں۔ کیونکہ خلاف منشائے الٰہی اور سنتِ صالحین ہے۔

لیکن لائق مؤلف کی یہ طولانی بحث موصوف کے مفید مطلب ثابت ہو یا نہ ہو اس کا فیصلہ تو بعد کو ہو گا مگر بالفعل اس کی مستحق ضرور ہے کہ واقعہ نگاران عالم دنیا کے عجیب و غریب کارناموں کے سلسلہ میں مؤلف کی اس ہمت کا ذکر جو اپنی نوعیت میں فرد ہے بطور یادگار قلمبند کریں اور جلی قلم سے " فَاعْتَبِرُوْا يَا اُولِي الْاَبْصَار " لکھکر اس کے تحت میں یہ چودھویں صدی کا واقعہ لگارش فرمائیں کہ ایک دیرینہ اور بظاہر خوش عقیدت مرید کا یہ عدیم المثل ایثار بھی اپنی جدت کے اعتبار سے قابل عبرت ہے کہ سجادگی کی حمایت میں ارادت کو بالائے طاق رکھکر اپنے رہنمائے کامل کے حکم امتناع جانشینی کو بجائے تعمیل کرنے کے اصولِ مذہب کے خلاف ثابت کرنے میں تقریباً سو صفحات سیاہ کر ڈالے اور ایسے استدلال کا حوالہ دے کر جس کو اس بحث سے کوئی تعلق نہیں سمجھ لیا کہ خلافت و سجادگی کا سنتِ الٰہی ہونا ثابت ہو گیا۔

لیکن مؤلف موصوف کا یہ سمجھنا ان تخیلات اور توہمات سے کم نہیں جن کا وجود نہ تھا۔ نہ ہے نہ ہو گا۔ کیونکہ بہ نظر تنقید دیکھتے ہیں تو قابل مؤلف کی اس مطول بحث کو موصوف کے مقصد و مراد سے کوئی سروکار نہیں۔ اس لئے کہ آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ خالق عالم نے چونکہ آدم کو اپنا خلیفہ بنایا اور آدم نے شیث کو اپنا جانشین کیا علیٰ ہذا دیگر انبیا و مرسلین نے بھی اسی کی تقلید کی۔ اور خود بھی کسی نبی کے خلیفہ ہوئے اور کسی نبی کو اپنا خلیفہ ضرور بنایا۔ اسی اعتبار سے حضرات صوفیہ نے بھی اس طریقہ کو اختیار کیا تاکہ سنت الٰہی اور سنت انبیاء کی تقلید کا شرف حاصل ہو۔ اب اس جمہوری نظریہ سے اختلاف کرنا سنت خدا اور افعال انبیاء سے روگردانی کرنا ہے۔

حالانکہ یہ تمہید مولف کے دعویٰ کے لئے کسی پہلو سے دلیل نہیں ہو سکتی اس واسطے کہ اول تو جس طرح اس بحث کا ابتدائی یہ جملہ بالکل صحیح ہے کہ خدا نے آدم کو اپنا خلیفہ کیا۔ اسی طرح یہ قطعاً خلاف ہے کہ جملہ انبیاء علیہ السلام نے اس کی تقلید فرمائی کہ خود بھی کسی نبی کے خلیفہ ہوئے اور کسی نبی کو اپنا خلیفہ ضرور بنایا۔

بلکہ صریح اتہام ہے اور عقائد اسلام میں انبیاء کو متہم کرنا کفر ہے مگر افسوس مولف ممدوح نے اس کا کبھی خیال نہیں فرمایا۔ کہ انبیاء علیہم السلام کو بے بنیاد احاطہ تقلید میں محصور کرنا نقص ایمان کی عین دلیل ہے کیونکہ ایسے فعل کا ان کو مکلف قرار دینا جس کے لئے منجانب اللہ وہ مامور تھے نہ بطور خود ان مقربین بارگاہ صمدیت نے کبھی اس تقلید کا ارادہ ظاہر کیا۔ اور جب کہ اس تقلید کے لئے وہ مجبور نہ تھے تو لازمی ہے کہ اس کا ترک بھی وقوع پذیر ہوا اور ہوا جس کی وجہ سے حسب ارشاد مولف وہ معصوم ایک ثقیل جرم کے مرتکب ہوئے کہ خلافت کی قطعیت کا لحاظ نہیں کیا۔ اور اگر خلیفہ نہ ہوئے اور خلیفہ نہ کرنے کے بعد بھی وہ معصوم سمجھے گئے۔ تو خلافت اور جانشینی کا قطعی ہونا کالعدم ہو گیا۔

الغرض مولف موصوف کا یہ پہلا حملہ تھا جو آپ کی ذہانت کا معرف ہونے کے ساتھ آپ کی قادر اندازی کا بھی زبان حال سے شاہد ہے کہ آپ کے تیر جستہ نے نشانہ غلط ہونے کی وجہ سے بجائے ان گم کردہ راہ کے جو خلافت اور سجادگی کو غیر ضروری سمجھتے ہیں انبیاء علیہم السلام کی خداداد معصومیت کو بغیر کسی قصور کے کم سے کم مجروح ضرور کر دیا۔

دوم یہ کہ حضرت رب العزت کا آدم کے حق میں اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً فرمانا صحیح ہے مگر یہ فعل خداوندی نہ ہم دوں کیواسطے بصورت امر قطعیت کا حکم نہیں رکھتا اسی واسطے بجز معدودے چند انبیاء کے زیادہ تعداد افضل انبیاء مرسلین کی ہے جنہوں نے کسی کو اپنا خلیفہ نہیں کیا مثلاً حضرت عزیر، حضرت شعیب، حضرت یوسف، حضرت صالح، حضرت یحییٰ، حضرت ہود حتیٰ کہ صاحب کتاب حضرت عیسیٰ علیہم السلام وغیرہ جن کا کوئی خلیفہ نہ تھا لہذا اگر خلیفہ بنانا امر قطعی ہوتا تو یہ مقربین بارگاہ احدیت اپنا خلیفہ ضرور

اور اگر چند انبیا نے ضرورت کے لحاظ سے یا بہ مصلحت یا حسب منشا آلٰہی کسی کو خلیفہ کیا بھی ہے تو اس فہرست میں ایسے بھی جلیل القدر رہنماؤں کے نام نامی ہیں جو خود کسی کے خلیفہ نہ تھے۔ جیسے حضرت موسیٰ، حضرت ابراہیم، حضرت نوح علیہم السلام۔ پس اگر خلیفہ ہونا بھی لازمات سے ہوتا۔ تو یہ رسالت کے علمبردار بھی جو مولّف موصوف سے عقل و فہم علم و عمل۔ حق پرستی خداشناسی۔ ایمان و ایقان۔ حقانیت و روحانیت میں بہت زیادہ افضل اور بہتر تھے۔ خلیفہ ہونے کی جستجو کرتے۔ مگر جب کہ متحقق طور پر ثابت ہے کہ ایسا نہیں ہوا تو خلافت و سجادگی کا غیر قطعی ہونا صاف ظاہر ہو گیا۔

قطع نظر ان تصریحات کے ہمارے آقائے نامدار، سید الابرار، اشرف انبیا، حبیب خدا احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس اور عدیم النظیر سیرت کے مطالعہ سے نمایاں ہوتا ہے کہ نہ آپ کسی کے خلیفہ تھے اور نہ آپ نے اپنی جانشینی کیواسطے کسی کو نامزد فرمایا۔ چنانچہ جملہ مورخین متفق ہیں کہ بعد وصال مہاجرین اور انصار کی اتفاق رائے سے حضرت ابوبکرؓ مسند آرائے خلافت راشدہ ہوئے۔

اور یہ بھی مسلمہ ہے کہ تاجدار مدینہ کی ذات بابرکات رموز و اسرار سے خبردار بلکہ تمام عالم کی اصل و حقیقت اور جملہ موجودات کی نوعیت اور ماہیت سے آگاہ تھی۔ اور علاوہ اس فضل کے باعتبار عبدیت احکام خداوندی کی بجاآوری جس خوبی اور مستعدی سے آپ نے کی اس کا قرآن شاہد ہے کہ فرائض و واجبات کا ذکر کیا مستحبات تک کی رضائے آلٰہی کے واسطے خود بھی تعمیل کی۔ اور اطاعت رب العزت کی اہمیت سے اپنی امت کو اس وضاحت سے ہدایت فرمائی کہ اب قیامت تک کسی ہادی کی ہم کو ضرورت نہ رہی۔ اس واسطے کہ علاوہ عقائد اور اعمال کے فروعات میں کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کی تصریح و تشریح آپ کے اقوال و افعال سے کافی طور پر نہ ہوتی ہو بجز اس کے کہ خلیفہ ہونا اور خلیفہ کرنا جو بقول مولّف موصوف شرط لازمی ہے اس کا علم شاید (معاذ اللہ)

آپ کو نہ تھا۔ ورنہ امت کو خلیفہ ہونے اور خلیفہ کرنے کی بالتصریح ہدایت آپ فرماتے اور خود بھی خلیفہ ہونے کی جستجو کرتے اور اپنی جانشینی کے واسطے کسی کو نامزد ضرور فرماتے مگر ایسا نہیں ہوا۔ کتب عقاید و اعمال میں اس کا ذکر ہے نہ سیرت رسالت میں اس کا تذکرہ ہے۔

اب مولف موصوف سے دریافت طلب امر یہ ہے کہ حضرت سید السادات سرور کائنات بہترین عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس فرد گذاشت کی نسبت آپ کا کیا ارادہ ہے مگر یہ بھی پیش نظر رہے کہ اس تیرہ سو برس کے دوران میں ہزاروں جلیل القدر علما اور متعدد مقدس اور کبیر الشان صوفی ایسے گزرے ہیں جن کے تبحر اور تقدس کا نقارہ آجتک دنیا میں بج رہا ہے انھوں نے اپنے نبی کی پاک اور مطہر ہستی کو جملہ عیوب سے معرا فرمایا ہے اس لئے میری ناقص رائے یہ ہے کہ اس موقع پر آپ بھی کوئی اجتہادی خیال ظاہر کرنے میں عجلت نہ فرمائیں کیونکہ محبوب خدا کا معاملہ ہے بلکہ بہتر ہوگا کہ یہ کہکر اس قضیہ کو رفع کر دیا جائے کہ بقول "اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ" یہ اقتضائے بشریت آپ خلیفہ ہونا اور خلیفہ کرنا بھول گئے کیونکہ انسان کی خلقت خطا و نسیان سے مرکب ہے۔ "اَلْاِنْسَانُ مُرَكَّبٌ مِّنَ الْخَطَاءِ وَالنِّسْيَان"

اور اگر ایسا نہ کیا اور آپ نے کوئی جملہ قلم برداشتہ منافی شان حضرت رسالت لکھدیا تو وہ نقصان اٹھانا ہوگا جس کی تلافی ناممکن ہے اور جس طرح مرشد برحق کے حکم قطعی پر اعتراض کرکے اپنی ارادت کے شفاف دامن پر بدنما داغ لگا کر بیکار کر دیا اسی طرح رحمۃ للعالمین کا دامن چھوٹا تو بیڑا پار ہونا مشکل ہوگا۔

مگر واضح رہے کہ یہ مشورہ آپ کے حسب حال اور آپ کے خیال کے مطابق ہے ورنہ میں تو بآواز بلند یہی کہوں گا کہ ہمارے امی لقب رسول کریم علیہ التحیۃ والتسلیم صاحب لوائے انا مدینۃ العلم ہیں اور قرآن شاہد ہے کہ آپ کے اقوال و احکام الٰہی کے مطابق اور افعال منشار ایزدی کے موافق ہیں اس لئے آپ کا جانشینی کے واسطے کسی کو نامزد نہ کرنا۔ اس کی عین دلیل ہے کہ خلیفہ ہونا اور خلیفہ کرنا نہ مذہبًا

شرط لازمی ہے اور نہ جناب باری جل جلالہٗ کا اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً
فرمانا بندوں کے واسطے بمنزلہ امر حکم قطعی ہے۔

علیٰ ہذا الائق مولف کا یہ طبع زاد مضمون بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے قابل دید ہے
کہ خلیفۃ اللہ اور خلیفۃ المشائخ جو صدہا سال سے مختلف الحال سمجھے جاتے تھے ان کو موصوف
کی فطرتی ذہانت نے ایک صف میں اور ایک حیثیت سے کھڑا کر دیا اور بغیر کسی پس و پیش کے
لکھ دیا کہ خلفاء شریعت اور خلفاء طریقت کے صفات ایک ہیں۔

مولف موصوف نے ہر دو خلافت کے رخ سے فرق دامتیازنہ کا حقیقی پردہ اس واسطے
اٹھا دیا اور محققین ماسلف کی قایم کردہ لفظی اور معنوی تفریق کو متحد کرنے سے یہ فائدہ
حاصل کرنا چاہا تھا کہ خلافت مشائخین بھی کسی طرح "اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً"
کے تحت میں آجائے تاکہ خلافت انبیاء کو جس طرح شرط لازمی کہہ چکا ہوں اسی طرح
خلافت صوفیہ کو بھی قطعی کہنے کا موقع مل جائے۔

یا مولف موصوف کو اپنی سادہ مزاجی کے لحاظ سے یہ مغالطہ ہوا کہ ہر دو جماعت کے
نام نامی کے ساتھ لفظ خلیفہ کو یکساں مستعمل ہوتے دیکھا تو شاید یہ خیال ہوا ہو کہ جس طرح
دونوں کا خطاب ایک ہے اسی طرح بالمعنی بھی حیثیت دونوں کی یکساں ہوگی اس لئے
آپ کی چشم وحدت بین سے دوئی کا حجاب اٹھا دیا۔ اور دونوں خلافتوں کو بمفہوم واحد
حضرت احدیت جل جلالہٗ کا خلیفہ سمجھنے کی ترغیب فرمائی۔

اس اعتبار سے تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بڑی خیریت ہوئی کہ مولف ممدوح نے حکمران بنی
عباسیہ کے خطاب حکومت کی جانب توجہ نہیں فرمائی ورنہ ان کے ناموں کے ساتھ
لفظ خلافت کو ضم دیکھتے۔ تو بعید نہ تھا کہ اس کو تیسری خلافت سمجھکر پہلی دونوں خلافتوں
میں شریک کر دیتے اور فرماتے کہ ہر سہ خلافت کی ایک شان ہے۔ تو قدیم مقولہ
.. اَلتَّوْحِیْدُ فِی التَّثْلِیْثِ وَالتَّثْلِیْثُ فِی التَّوْحِیْدِ .کا مضمون ہو جاتا۔

علاوہ اس کے ہندوستان میں بعض پیشہ وروں کو عرف عام میں خلیفہ کہتے ہیں۔ لیکن مؤلف موصوف کو مضمون آرائی کے وقت اگر اس عرفیت کا خیال آجاتا تو قرینہ یہ کہتا ہے کہ ان اقوام اہل حرفہ کو بھی آپ کسی نبی یا ولی کا جانشین ضرور فرماتے اور دلیل یہ پیش کرتے کہ اگر خلافت اور سجادگی لازمی نہ ہوتی تو ان فرقوں میں نسلاً بعد نسلاً باپ کے بعد بیٹا خلیفہ کے خطاب سے نامزد نہ ہوتا۔

خلاصہ یہ کہ لفظ خلیفہ کی مشارکت سے مؤلف نے مقربین بارگاہ احدیت کی ہر دو جماعت کے مدارج و مراتب کو متحد اور مساوی سمجھا اور حمایت سجادگی کے انہماک میں خلیفۃ اللہ اور خلیفۃ المشائخ کی واضح اور بین تفاوت کو حقیقت کی عینک سے نہیں دیکھا اور آنکھ بند کر کے لکھدیا کہ دونوں خلافتوں کی ایک شان ہے۔

حالانکہ طبقۂ اسلام میں شریعت اور طریقت کا نام ایسا مشہور اور زبان زد ہے جسکے فرق امتیازی سے عام مسلمان واقف ہیں۔ اور معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ خلافت آدم علیہ السلام کے درجات و مقامات اور ہیں اور خلفائے مشائخین رحمہم اللہ کے صفات اور خدمات اور ہیں۔ وہ خلافت ضمیمۂ رسالت ہے اور یہ خلافت شعبۂ ولایت ہے۔ وہ انبیاء کے جانشین اور یہ اصفیا کے قائم مقام ہوتے ہیں۔ اور دونوں جماعتوں کے ہدایات اور تعلیمات میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔

چنانچہ علمائے کرام اور صوفیائے عظام کا اتفاق ہے کہ خلیفۃ اللہ شریعت کے احکام ظاہری کا مبلغ ہوتا ہے اور خلیفۃ المشائخ اخلاق باطنی کا معلم ہوتا ہے خلیفۃ اللہ کی تعلیم سے اقوال و افعال شائستہ ہوتے ہیں۔ اور خلیفۃ المشائخ کی تربیت سے خیال پختہ اور احوال صحیح ہوتے ہیں۔ خلفائے شریعت کی تعلیم کا فائدہ متعلم کی ذہانت اور حافظہ پر منحصر ہے اور متعلمین طریقت کی کامیابی مرشد کامل کی توجہ اور تصرف پر موقوف ہے خلیفۃ اللہ کی تعلیم زبانی ہوتی ہے۔ اور خلیفۃ المشائخ کی تعلیم روحانی ہوتی ہے۔ وہ تعلیم کتابی ہو

صفات ظاہری کو درست کرتی ہے اور یہ تربیت قلبی ہے جس سے روحانیت میں اضافہ اور محبت الٰہی میں روز افزوں ترقی ہوتی ہے۔

اسی طرح دونوں کی تعلیم و تربیت کے اثرات بھی جداگانہ ہوتے ہیں اس کا متعلم حقائق دین کی معلومات کے ساتھ دنیوی معاملات اور ضروریات کا بھی التزام کرتا ہے اور اس کا متعلم خیال یار میں دین و دنیا سے دست بردار ہو کر زبان حال سے کہتا ہے۔

مامقیماں کوئے دلداریم — رخ بدنیا و دیں نمی آریم

علم شریعت کا باعمل فارغ التحصیل حور و قصور کا مستحق ہوتا ہے اور طریقت کا کامل الیقین سالک تجلی انوار شاہد مطلق کا مشاہدہ کرتا ہے اور حیات ابدی پاتا ہے۔ بقول

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

علیٰ ہذا۔ ہادی شریعت اور رہنمائے طریقت کے طرز ہدایات میں بھی کافی تفریق ہے۔ خلیفۃ اللہ خاص و عام کی تبلیغ کے واسطے مامور ہوتے ہیں اور خلفائے صوفیہ صرف طالبان حق کی رہنمائی کرتے ہیں۔ خلیفۃ اللہ چونکہ ہدایت عام کا علم بردار ہوتا ہے اس لئے اس کا منصب یہ ہے کہ منکرین کے گھروں پر ان کی عبادت گاہوں میں ان کے مذہبی جلسوں میں جا کر ہدایت کی تبلیغ کرتا ہے اور خلیفۃ المشائخ اپنی خانقاہ کے گوشہ عزلت میں بیٹھکر ان مخصوص اہل صدق و خلوص کی تربیت فرماتا ہے جو طلب الٰہی میں اپنے گھروں کی راحت و عافیت چھوڑ کر آتے ہیں اور زاہدانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔

غرض انہیں تمثیلوں سے خلیفۃ اللہ اور خلیفۃ المشائخ کے درجات و خدمات میں جو نمایاں طور پر فصل اور تفرقہ دکھایا گیا ہے اس سے ظاہر ہو گیا کہ جس طرح خلفائے شریعت اور خلفائے طریقت کی نسبت میں صریح تفریق ہے اسی طرح دونوں کی تعلیم و تربیت بھی جداگانہ ہے۔ اور مولف موصوف کا وہ طولانی استدلال جس سے وہ دونوں کی ایک شان اور ایک تعریف ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ نقش برآب سے زیادہ وقعت

نہیں رکھتا۔ بجز اس مناسبت کے جیسی خلافت انبیاء غیر قطعی ہے۔ ویسی خلافت مشائخین بھی لازمی نہیں ہے۔

اسی کے ساتھ مولف موصوف نے اپنے استدلال کو دقیق اور مدلل کرنے کے واسطے بعض اہل سلسلہ حضرات صوفیہ کے سطحی حالات لکھکر شجرۂ نادریہ و چشتیہ۔ شاید اس خیال سے نقل فرمایا ہے کہ خلافت اور جانشینی کو علی النسل دیکھ کر محدود النظر قارئین کو یہ شبہ ہو کہ ایسے ایسے مشاہیر صوفیہ جب کہ خود بھی خلیفہ تھے اور انھوں نے اپنا خلیفہ اور جانشین بھی کیا ہے تو خلافت لازمی ہوتی ہے۔

لیکن اوپر گذارش کر چکا ہوں کہ خلافت حضرات مشائخین نہایت مستحسن ہے اور سلاسل صوفیہ بجائے خود بہت صحیح ہیں۔ اور اس کا بھی اعتراف ہے کہ وہ قدار سیدہ بزرگ اپنے رہنمائے کامل کے خلیفہ تھے۔ اور ان کے جو خلیفہ اور جانشین ہوئے وہ بھی برسر حق تھے۔

مگر خلافت اور جانشینی کا لازمی اور قطعی ہونا۔ نہ تصانیف حضرات صوفیہ سے ثابت ہوتا ہے۔ نہ آپ کے اس مطول استدلال سے۔ کیونکہ اس کا بھی حوالہ دے چکا ہوں کہ بعض ایسے جلیل القدر اولیائے عظام گزرے ہیں جن کی عظمت وجلالت کا ارباب شریعت اور اصحاب طریقت کو اعتراف ہے مگر انھوں نے کسی کو اپنا خلیفہ نہیں کیا بلکہ انھوں نے اپنے مسلک و مشرب کے اعتبار سے خلافت اور جانشینی کو غیر ضروری متصور فرمایا۔ پس اگر خلیفہ اور جانشین کرنا لازمات اور واجبات سے ہوتا تو وہ برگزیدہ حق ایسا نہ کرتے۔

بلکہ خلیفہ کرنا اگر قطعی ہوتا اور ان حضرات سے عمداً نہیں سہواً بھی اگر اس کا ترک وقوع پذیر ہوتا تو ضرور تھا کہ ان کے ہمعصر مشائخین ان کی اس فرو گذاشت کا کم سے کم استعجاب ہی کے لہجہ میں ذکر کرتے مگر ایسا بھی نہیں ہوا۔

بلکہ برخلاف اس کے بڑے بڑے ذی مرتبت ارباب طریقت نے انھیں تارکین خلافت کو اپنا مرشد اور رہنما سمجھا۔ اور ان کے تقدس کا بکمال ارادت ذکر کیا۔ اور کرتے ہیں۔

اور ان کی روحانیت سے مستفیض ہوئے اور ہوتے ہیں۔ اور فخر و مباہات کے ساتھ فرمایا اور فرماتے ہیں کہ ہم بطریق اویسیہ مستفید اور داخل سلسلہ ہوئے۔

قطع نظر اس کے۔ میں تو یہ عرض کروں گا کہ ان مشہور تارکین خلافت کے علاوہ جن کے نام نامی کتب سیر میں جو قلم سے مسطور ہیں اگر بہ نگاہ تامل دیکھا جائے تو مشائخین عظام کے ان مخصوص سلسلوں میں جو خلافت اور جانشینی کے ممد اور معاون ہیں ایسے حضرات کے اسمائے گرامی بکثرت نظر آتے ہیں جن کو اپنا خلیفہ اور جانشین کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ پس اگر خلیفہ کرنا لازمات سے ہوتا تو نہ ان حضرات سے یہ فرو گذاشت ہوتی۔ اور اگر ہوتی تو ان کے انجاں ملت ضرور معترض ہوتے مگر ایسا کبھی نہیں ہوا اور نہ قصص صوفیہ میں اس کا ذکر ہوتا۔

مگر برخلاف اس کے دیکھتے یہ ہیں کہ ان تارکین خلافت کا ہنوز وہی وقار اور اقتدار قائم ہے جو ایک برگزیدۂ خدا صوفی کا ہونا چاہیئے کہ حامیانِ خلافت ان کے اقوال و افعال سے استنباط کرتے ہیں۔

یہ واقعات عین دلیل ہیں کہ طبقات صوفیہ میں خلیفہ کرنا لازمی نہیں ہے اس لئے کہ اگر خلافت قطعی سمجھی جاتی تو یہ حق پرست گروہ کبھی اور کسی حالت میں تارکین اور مانعین خلافت کی اتباع نہ کرتا۔ اور ان کو برسر حق نہ سمجھتا۔

مگر خلیفہ کرنے اور نہ کرنے کا بظاہر یہ سبب معلوم ہوتا ہے کہ حضرات صوفیائے کرام کا مسلک ان کے احوال کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ اور ان کے خیالات و معاملات اسی مناسبت سے ہوتے ہیں جو مسلک کا اقتضا ہوتا ہے۔ اور اقسام احوال لاتعین ہیں۔ اس لئے ان کے مشربی مگر فروعی معاملات میں بظاہر اختلاف نظر آتا ہے لیکن اس بیرونی اختلاف سے ان کے ان کے اندرونی اتحاد کو صدمہ نہیں پہنچتا۔ گو روش جداگانہ ضرور ہوتی ہے لیکن ان کے خیالات کا نتیجہ آخر چونکہ ایک ہوتا ہے اس واسطے حقیقی اتحاد کی مستحکم بنیاد، فروعات کے تغیرات سے متزلزل نہیں ہوتی۔

مثلاً طریقۂ بیعت کو دیکھا جائے تو چودہ خانوادوں کے خیالات متحد ہونا تو محالات سے ہے صرف دو خانوادوں میں بھی مشربی رسومات ایک صورت سے ملتی ہوں نظر نہیں آتا۔ کیونکہ ایک سلسلہ میں بیعت کے وقت اگر کلاہ پوشی کا دستور ہے تو دوسرے سلسلہ میں اس کا ذکر بھی نہیں بلکہ دیگر مشائخین اس کو غیر ضروری جانتے ہیں۔

کسی سلسلہ میں بہنگام بیعت جام نوشی کا طریقہ لازمات سے گردانا ہے مگر دوسرے خاندان کے رہنماؤں نے اس کو بے ضرورت متصور فرمایا ہے لیکن بجائے جام نوشی کے اس گروہ میں کوئی دوسری رسم ایسی مروج ہے جو پہلے سلسلہ میں نہیں ہے۔

حتیٰ کہ بعض مراسم مروجہ ایسے بھی ہیں جن کا ادا کرنا اگر ایک سلسلہ میں مستحسن قرار دیا گیا تو دوسرا گروہ ان کو مکروہ یا ممنوع جانتا ہے جیسا کہ ایک سلسلہ میں بیعت کے وقت چہار ابرو کی موتراشی بکمال اہتمام کی جاتی ہے۔ مگر دوسرے سلاسل میں اس کا وجود بھی نہیں۔ بلکہ بعض مشائخین نے اس کا ذکر بالاکراہ کیا ہے۔ اور بعض طبقات میں یہ فعل صریح ممنوع ہے۔

اسی طرح بر عکس۔ سماعت سماع کا مسئلہ ہے کہ ایک مقدس اور ممتاز گروہ اس کو غذائے روحی اور بمنزلہ عبادت کے جانتا ہے اور دوسری خدا پرست جماعت حرمت سماع کی قائل ہے۔ بقول ع "ببین تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا"

یہی تفرقہ خیالات لباس اور لباس کے رنگ میں ہے۔ یہی صورت طرز معاشرت میں دکھائی دیتی ہے کہ بعض نے تزویج کو بہتر جانا ہے بعض نے تجرید کو افضل فرمایا ہے۔ بعض بمصداق "دل بہ یار دست بکار" زندگی بسر کرتے ہیں۔ بعض تعلقات موجودات سے انقطاع قطعی کو مفید سمجھتے ہیں۔

لیکن باوجود ایسے ایسے قوی اور متضاد اختلاف کے عمل ہر دو فریق کا یہ ہے کہ ایک دوسرے کے تصرفات سے استفادہ کرتا ہے چنانچہ دیکھتے ہیں کہ اکثر بزرگان

نقشبند خواجگان چشت کے فیضان باطنی سے مستفیض ہوئے جیسے کہ شاہ سید ابوالعلا صاحب نقشبندی اکبرآبادی علیہ الرحمۃ حضرت غریب نواز خواجہ اجمیری قدس سرہ العزیز کے فیضان باطنی سے مستفیض ہوئے۔

علیٰ ہذا ایسی مثالیں متعدد ہیں کہ باوجود ظاہری اختلاف کے صوفیائے کرام میں کامل مساوات ہے اور بجائے افتراق کے باہمی اتحاد اور اتفاق ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ اصول جملہ حضرات کا ایک ہے اور چونکہ رسوم خاص اور مسائل فرعیہ کی حیثیت سے ہمیشہ عارضی اور شخصی ہوا کرتی ہے اس واسطے وہ داخل اصول نہیں سمجھے جاتے اسی وجہ سے ان کی تفریق پر کوئی فریق خیال نہیں کرتا۔ اور جو رسوم جس سلسلہ میں مقرر اور معین ہیں ان کے جواز اور عدم جواز پر دوسرے سلسلہ کے شیوخ بھی اس اہمیت کے لحاظ سے اعتراض کرنے کی جرأت نہیں کرتے کہ وہ قایم کردہ ان عدیم النظیر ہستیوں کے ہیں جن کے تبحر اور تقدس کا جملہ حضرات صوفیہ کو اعتراف ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ ان رسوم کا تعین بخیال حقانیت ہوا ہے نہ بجہت نفسانیت۔

اسی قبیل سے خلافت اور جانشینی کا مسئلہ ہے کہ رفیع المرتبت ارباب طریقت نے لبقائے سلسلہ اور ہدایت عامہ کے واسطے خلیفہ اور قایم مقام بنانا اختیار کیا اور اپنے وسیع علم کا خلاصہ ایسے آسان اور عام فہم الفاظ میں کیا جو منازل سیر سلوک طے کرنے میں طالبین راہ حق کے واسطے کافی توشہ ہے۔

اور چونکہ یہ طریقہ اظہار حق اور مفاد خلق سے تعلق رکھتا ہے اس لئے مشائخین نے اس کو مستحسن سمجھا اور اس پر عمل بھی کیا۔ اور بوساطت خلفار مختلف مقامات پر ان کے علم کی تعلیم و تربیت بھی ہونے لگی۔

لیکن حضرات عاشقین نے اس وجہ سے خلافت کو غیر ضروری متصور فرمایا کہ ان کا خدا داد علم بندوں کی تعلیم سے قطعاً بے نیاز تھا کیونکہ جملہ حضرات صوفیہ کا اتفاق ہے کہ

عشق اکتساب سے ہوا۔ اور عنایت وہبی پر موقوف ہے اور ان کے اس خیال کو دیگر صوفیائے کرام نے اعتراض کی نظر سے اس لئے نہیں دیکھا کہ خلافت اور جانشینی بمنزلہ وجوب اور فرضیت کے نہ تھی۔ ہمیشہ سے اس کی حیثیت غیر قطعی رہی کہ حضرت رب العزت نے آدم علیہ السلام کو خلیفۃ اللہ کا خطاب مزدہ مرحمت فرمایا۔ مگر بنی آدم کو اس کی تقلید کے لئے مامور نہیں فرمایا۔

اسی طرح انبیاء و مرسلین علیہم السلام کے عہد میں بھی خلافت کی یہی صورت رہی کہ بعض نے بہ نظر رفاہ خلق اپنے اس بیٹے کو جو خود نبی تھا یا بعد ان کے نبی ہونے والا تھا اپنا قایم مقام کیا جیسا کہ آدم علیہ السلام نے شیث علیہ السلام کو ہدایت خلق کے واسطے اپنا جانشین کیا۔

اور بعض نے اپنی ضرورت کے وقت عارضی طور پر استخلاف کیا جس کو قطعیت سے کوئی واسطہ نہیں جیسے موسیٰ علیہ السلام جب ایک مدت معینہ کے واسطے کوہ طور پر جانے لگے تو امت کی نگرانی کے لئے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو اپنے عدم موجودگی تک کے واسطے اپنا قایم مقام بنایا۔

اور زیادہ تعداد ان انبیا و مرسلین کی ہے جنہوں نے ضرورت کے وقت بھی اپنا خلیفہ اور جانشین کسی کو نہیں بنایا یہ جملہ واقعات عدم وجوب خلافت کے شاہد صادق ہیں۔

علیٰ ہذا عہد حضرت ختم الرسالت کے بعد جب بجز ارباب ولایت کے خلق کا کوئی ہادی نہ رہا تو ایک طرف علمائے کرام نے احادیث نبوی سے استنباط فرما کر خلق کی ہدایت کے واسطے دستور العمل بنایا۔ اور دوسری طرف اصحاب طریقت نے قدیم طریقہ پر خلافت کی بنیاد ڈالی تھی اور چونکہ خلافت شریعت خود غیر قطعی تھی اس وجہ سے خلافت طریقت کی حیثیت بھی غیر قطعی رہی۔ جس مقتدائے خلق نے مفید سمجھا اس نے اپنا خلیفہ بھی کیا اور جانشین بھی۔ اور جس کو غیر ضروری ثابت ہوئی اس کا نہ کوئی خلیفہ ہوا نہ جانشین۔ اور ہر دو جماعت میں

کوئی کسی کے فعل پر معترض بھی نہیں ہوا اسی اعتبار سے ہمارے حضور قبلہ عالم نے اپنے
ارادتمندوں کو سمجھادیا کہ چونکہ ہمارا مشرب عین عشق ہے اس لئے ہمارا کوئی خلیفہ نہ جانشین
لیکن مولف موصوف کے طبع زاد اجتہاد کا یہ کارنامہ اس بازیگر کے تماشے سے
کم تعجب خیز نہیں ہے - جو بر سر عام اپنی تیزدستی سے کبھی ایک روپیہ کے دو روپیہ اور کبھی دو
کا ایک روپیہ بنا کر لڑکوں کو متحیر کرتا ہے۔

حالانکہ اصل اس شعبدہ کی صرف اس کے ہاتھوں کی صفائی ہوتی ہے اور فی الحقیقت
وہ چالاک دست نہ ایک روپیہ کے دو بناتا ہے اور نہ دو کا ایک ہو جاتا ہے۔

وہی مضمون مولف کی بے بنیاد معلومات کا ہے کہ کبھی تو نص قرآن کے حوالہ سے
وجوب خلافت کو خود ساختہ اور غیر مربوط استدلال سے ثابت کرنا چاہتے ہیں اور کبھی
متضاد حیثیت کی دو خلافتوں کو ایک نو ایجاد سانچے میں ڈھال کر فرماتے ہیں کہ یہ دونوں
درحقیقت ایک ہیں۔ اس واسطے یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ آپ کی ذہانت کا یہ کرشمہ بازیگر
کی چالاک دستی کی طرح نقش برآب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

اسی کے ساتھ یہ بھی عرض کردوں گا کہ لائق مولف کا وہ فلسفہ بھی قابل تردید ہے جو
رہنمائے کامل کے حکم امتناع سجادگی کی تنقید اور تردید سے تعلق رکھتا ہے خصوصاً اس کی
انشاپردازی کا مطالعہ تو دلچسپی سے خالی ہو ہی نہیں سکتا۔

چنانچہ مولف ممدوح نے پہلے باوجود اس گہرے اختلاف کے بکمال فصاحت عقیدت
مندانہ لہجہ میں اس کی شہادت دی ہے کہ حضور قبلۂ عالم کا حکم امتناع جانشینی صادر فرمانا
صحیح ہے ۔ اور اپنی کتاب میں چند مقامات پر اس فرمان وارثی کا نہایت کشادہ پیشانی سے
ذکر بھی کیا۔ بلکہ باب ارشادات میں ۱۸۹ میں سرکار عالم پناہ کا یہ ملفوظ حرف بحرف نقل کیا
کہ " منزل عشق میں خلافت نہیں اس لئے ہمارا کوئی خلیفہ نہیں ہے "

بلکہ فاضل مولف کی تحریر سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ کے والد بزرگوار نے بھی یہ

فرمان قطعی سرکار عالم پناہ کی زبان مبارک سے سنا تھا۔ چنانچہ مولف نے صفحہ ۳۶ میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ ظہور اشرف صاحب ساکن امیٹھی ضلع لکھنؤ نے شہرت کی کہ ہم کو حضرت سلطان الاولیا نے اپنا خلیفہ بنایا۔ اور حکم دیا کہ تم ہمارے خلیفہ ہو شدہ شدہ یہ خبر موضع گدیہ ضلع بارہ بنکی میں پہنچی اس وقت والد ماجد مولف اور محمد امین الدین صاحب رئیس گدیہ واسطے دریافت کرنے اس خبر کے، حضرت سلطان الاولیا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضرت صاحب سے کہا کہ حضور نے ظہور اشرف صاحب کو خلیفہ بنایا یہ سنکر ہم لوگ آئے ہیں کہ حضور سے دریافت کریں حضرت نے فرمایا کہ "ہمارے یہاں عشق ہے خلافت نہیں ہے " کیا ہم پیرزادے ہیں۔؟

لائق مولف نے اپنے والد مرحوم کی یہ شہادت قلمبند فرما کر حضور قبلہ عالم کے حکم قطعی کی صحت و صداقت کا خود بھی اقرار کیا۔ اور اس واقعہ کے تحت میں لکھدیا کہ آپ کا فرمانا صحیح ہے اور مولف کو اس امر کی کماحقہ تصدیق ہے۔

لہذا حضور قبلہ عالم کا مسترشدین کے حق میں یہ حکم صادر فرمانے کا علم مولف اور مولف کے پدر بزرگوار کو ہونا جب کہ ثابت ہو گیا تو بظاہر اب کسی بحث کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن جس طرح لائق مولف کو اس ملفوظ قطعی کا علم تھا اسی طرح بارگاہ مبدا فیاض سے توفیق نہیں مرحمت ہوئی تھی اور یہ مسلمہ ہے کہ علم بے عمل فائدہ سے خالی اور نقصان سے معمور ہوتا ہے جیسا کہ مولانا علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں۔

علم چوں بر دل زنی یارے بود　　　علم چوں بر تن زنی مارے بود

اس لئے اقرار کامل کے بعد مولف موصوف کو پھر سجادہ پرستی کا جوش ہوا اور پیشوائے برحق کے حکم امتناع سجادگی کے بامحاورہ الفاظ کی بعنوان تردید ایسی بے محل تاویل کی جس کا خراب اثر مریدکے ایمان و ایقان کو تباہ و برباد کرتا ہے اور اس کی تلافی بہت دشوار ہوتی ہے۔

یعنی مولف نے کسی مصلحت سے اقرار تو کر لیا تھا کہ آپ کا فرمانا صحیح ہے۔ اور مولف

کو اس امر کی کماحقہٗ تصدیق ہے لیکن آپ کی یہ تصدیق بالقلب نہ تھی۔ بلکہ بظاہر باللسان اور درحقیقت عارضی اور وقتی تھی۔ کیونکہ جس سطر میں یہ مصنوعی اور مشکوک تصدیق مسطور ہے اسی سطر میں بلکہ لفظ تصدیق کے بعد ہی آپ لکھتے ہیں مگر یہ الفاظ خلافت اور جانشینی کے جو زبان مبارک سے حضرت سلطان الاولیا کے برآمد ہوئے خالی از اسرار نہ تھے۔

لفظ اسرار کی تصریح لہذا موصوف کے متزلزل خیال میں چونکہ تیقن کی گنجائش نہ تھی۔ اس لئے آپ کے خدشات قلب کی ترجمانی آپ کی زبان نے کی۔ اور حضور قبلہ عالم کے حکم امتناع سجادگی کو پراسرار کہدیا جس کو دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ لفظ اسرار کے پردہ میں اس ارشاد کی تعمیل سے آپنے صریح انکار فرمایا۔

اب مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس کی صراحت کردوں کہ دنیائے علم میں لفظ اسرار کی تعریف کیا ہے پھر بہ نظر تعمق یہ دیکھا جائے کہ جس سلیس عبارت کو لائق مولف نے اسرار سے تعبیر کیا ہے اس کی کسی لفظ یا حرف یا معنی یا مفہوم پر اسرار کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں ۔؟

چنانچہ کتب لغات شاہد ہیں کہ لفظ اسرار جمع سر کے معنی راز اور استتار کے ہے۔ اور آج تک عرب اور عجم اور ہندوستان کے بلغا۔ فصحا۔ شعرا نے اپنی تحریروں میں خواہ وہ نظم ہوں خواہ نثر لفظ اسرار کے معنی راز مخفی اور مستتر کے اختیار کئے ہیں۔ بلکہ اصطلاحاً بھی کسی نے اسرار کو بجز رموز و اخفا کے دوسرے معنوں میں نہیں استعمال کیا ہے۔

اور میرے خیال میں لفظ اسرار کی شاید اس سے زیادہ تشریح و تصریح کی ضرورت اس واسطے بھی نہیں معلوم ہوتی کہ اسرار گو عربی زبان کا ایک لفظ ہے مگر اس قدر مشہور خلق کہ ہر ایک امد و دال بھی یہ جانتا ہے کہ اسرار کے معنی بھید اور پوشیدہ رکھنے والی بات کے ہیں۔

علیٰ ہذا لخصوصیات اسرار میں سے ایک مشہور اور مخصوص اسرار کا خاصہ یہ ہے کہ اسرار کا محل اظہار عموماً خلوت میں ہوتا ہے علاوہ اس کے اسرار ہمیشہ ان مخصوص جلیسوں یا ہم مذاق اور ہم مشربوں سے بیان کیا جاتا ہے جنکو مخلص اور محب اور امین سمجھتے ہیں اور اظہار

اسرار میں اس کی بھی احتیاط کی جاتی ہے کہ اغیار کے گوش گزار نہ ہو۔
خصوصاً ارباب طریقت تو اپنے مشربی اسرار کا اس قدر اخفا اور استتار فرماتے ہیں کہ
مسترشدین سے ان کی یافت اور استعداد کے مطابق گوشہ تنہائی میں بیان کرتے ہیں
اس واسطے اس فرمودۂ مرشد کو علم سینہ کہتے ہیں۔ یعنی مخفی اور پوشیدہ رکھنے والی بات
جس کو سفینہ سے تعلق نہیں ہوتا۔

اب انصاف کی عینک سے یہ دیکھا جائے کہ "اسرار" کے ان صفات اور تعریفات کو حضور
قبلۂ عالم کے الفاظ حکم امتناع سجادگی سے کیا مناسبت ہے اور آپ کے اس فرمان قطعی
کے کسی حرف پر بھی اسرار کا شبہ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس واسطے کہ اسرار کا اظہار عموماً
خلوت میں ہوتا ہے۔ اور سرکار عالم پناہ نے یار و اغیار۔ مریدین و غیر مریدین کے
سامنے بلا تکلف اور بغیر کسی احتیاط کے متواتر فرمایا کہ "ہمارا مشرب عشق ہے اس لئے ہمارا
کوئی خلیفہ نہیں جو محبت کرے وہ ہمارا ہے"۔

علیٰ ہذا یہ بھی مسلمہ ہے کہ راز ان مخصوص لوگوں سے بیان کیا جاتا ہے جو اس کی سماعت
کے اہل ہوتے ہیں۔ اور حضور قبلۂ عالم نے بغیر تخصیص حیثیت و استعداد اور بلا قید قوم
اور ملت بلکہ عوام اور خواص کے مجمع میں عام طور پر علی الاعلان فرمایا کہ "مشرب
عشق میں جانشینی نہیں ہے"۔

حتیٰ کہ حکیم صفدر علی صاحب ایسے مرید کے سامنے بھی جو آج اسی فرمان کی تردید کے
واسطے کمربستہ کھڑے ہوئے ہیں۔ حضور نے بے تکلف فرمایا کہ "ہمارا مشرب عشق ہے کوئی
ہمارا جانشین نہیں"۔

غرض اسرار کی لغوی اور اصطلاحی تعریف کسی عنوان سے حضور قبلۂ عالم کے حکم
امتناع سجادگی پر صادق نہیں آتی۔ اور نہ اس بامحاورہ عبارت کے کسی حرف کو مقطعات
سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

بلکہ اس مشہور کلیہ سے کہ اسرار درج سفینہ نہیں ہوتا۔ حضور کے حکم قطعی کی شان
بالکل جداگانہ ہے کیونکہ آپ کا فرمان امتناع سجادگی تو پہلے سب ارشاد سرکار عالم پناہ
ضبط تحریر میں آیا۔ پھر مصنفین نے اپنی تصنیفات میں لکھا۔ اور وہ چھپ کر شایع ہوا۔ بعدہٗ
مؤلفین سیرت وارثی نے بکمال صراحت تحریر کیا۔ یہاں تک کہ ہمارے مخاطب مؤلف جلوۂ
وارثی نے اپنی اسی کتاب میں چند مقامات پر نقل کیا ہے کہ حضور نے فرمایا "ہمارے یہاں عشق ہے خلافت نہیں ہے"
اور آخر میں اس فرمان قطعی کو صاحب جوڈیشل کمشنر بہادر لکھنؤ نے اپنے فیصلہ مورخہ ۱۴ مارچ
۱۹۱۷ء میں لکھا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے "اس ولی کا خاص اصول عشق الٰہی کی ہدایت تھی۔
اور محبت ایسی خاص اور پاک ترین قسم کی تھی۔ کہ یہ محبت انسان کو خدا سے متحد کر دیتی تھی۔ حاجی
صاحب نے فرمایا ہے کہ جو کوئی محبت کرے وہ ہمارا ہے۔ خواہ وہ چمار ہو یا خاکروب۔ عدالت
کے نزدیک یہ امر بخوبی ثابت ہے کہ حاجی صاحب نے اپنی حیات میں اکثر موقعوں پر زور
کے ساتھ اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ ان کے بعد ان کا قایم مقام نہیں ہو سکتا۔

الحاصل خصوصیات اسرار کو بھی حضور کے حکم قطعی سے کوئی سروکار نہیں۔ لیکن اس
کا کیا علاج کہ لائق مؤلف کی ارادت و عقیدت پر حمایت سجادگی کا اثر ایسا غالب
تھا کہ موصوف نے دیانت اور انصاف کے خلاف یہ لکھدیا کہ خلافت و جانشینی کے الفاظ
خالی از اسرار نہ تھے اور اس سے زیادہ تعجب خیز یہ امر ہے کہ مولف موصوف نے تعمیل
حکم امتناعی سے روگردانی کرتے میں حضور قبلۂ عالم کے حکم قطعی کے الفاظ سلیس
کو صرف پر اسرار ہی کہنے پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اپنی اس غیر مربوط تاویل کی تائید میں
ایک فاضلانہ دلیل پیش فرمائی ہے جس سے رہنمائے کامل کی اس ہدایت کو غلط اور خلاف
مذہب و مشرب ثابت کرنا آپ کو مقصود ہے۔

چنانچہ اسی سلسلہ میں آپ لکھتے ہیں کہ "اگر یہ الفاظ خالی از اسرار ہوتے تو ہرگز اللہ تعالیٰ
منزل عشق اور درجہ خلافت کو اپنی ذات خاص پر مقدم نہ کرتا۔ اور عالم ناسوت میں اس کا

اظہار نہ کرتا۔ اور اس منزل عشق و خلافت کا ذکر اپنے کلام پاک میں نہ فرماتا۔ اور اپنے حبیب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا اظہار اسی کلام میں نہ فرماتا۔ اور دیگر انبیاء مرسلین سے بھی اس کا ذکر نہ فرماتا۔ اور یہ عشق و خلافت بزرگان دین کے خاندانوں میں جاری و قایم نہ ہوتا پس معلوم ہوا کہ یہ سلسلہ خلافت قایم کردہ حضرت رب العزت جل شانہٗ ہے۔ جس پر خود کلام پاک شاہد ہے لہٰذا یہ طریقہ قیامت تک جاری رہے گا۔

دعویٰ برہانہ لائق مولف کا یہ عجیب و غریب فلسفہ بھی اپنی نظیر آپ ہے۔ حالانکہ ارباب علم کلام کے مبحث اکثر سنے اور دیکھا بھی کہ وہ حضرات مسئلہ زیر بحث کی وضاحت اس خوبی سے فرماتے ہیں کہ اس کی صحت اور عدم صحت منکشف ہو جاتی ہے مگر موصوف کی اس خانہ ساز منطق کے دلائل اس قدر دقیق اور پیچیدہ ہیں جن کا مفہوم سمجھنا اور مقصود سے واقف ہونا بجز مؤلف کے دوسرے شخص کو بہت دشوار ہے اس لئے میرا خیال یہ ہے کہ نہایت مناسب اور غایت موزوں ہوتا۔ اگر ممدوح الشان اپنی اس وسیع المعنی اور مغلق عبارت کی صفت میں یہ فرماتے ہیں کہ اس استدلال کے یہ بلیغ جملے خالی از اسرار نہیں ہیں تو پہلا شخص جو اس کا اعتراف کرتا وہ میں ہوتا"

بہر کیف عالی خیال مولف کے پیش کردہ استدلال کی عدیم النظیر انشا پردازی پر اس اعتبار سے تبصرہ نہ کروں گا کہ یہ تنقید مسئلہ زیر گفتگو سے بے تعلق ہوگی اور ذکر خارج عن المبحث طوالت وہی میں شمار ہوتا ہے لیکن اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ اس بے محل منطق نے جناب کے تبحر کی حیثیت اور تقدس کی حقیقت کو الشمس فی نصف النہار۔ ہویدا و آشکار کر دی۔

کیونکہ تبحر و تحقق کا شیرازہ تو اس وجہ سے منتشر ہو گیا کہ حضور قبلۂ عالم کی ہدایت عام کے بامحاورہ الفاظ کو پہلے مؤلف نے یہ فرمایا کہ "یہ خالی از اسرار نہ تھے" پھر اس کی دلیل میں یہ حجت پیش کی کہ اگر (وہ الفاظ) خالی از اسرار ہوتے تو ہرگز اللہ تعالیٰ منزل عشق اور درجہ خلافت کو اپنی ذات خاص پر مقدم نہ کرتا۔ اور اس منزل عشق کا ذکر اپنے کلام پاک میں نہ کرتا۔ اور

اپنے حبیب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا اظہار اسی کلام پاک میں فرماتا...."

اس پوری عبارت کو بار بار پڑھنے کے بعد بھی یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ ان جملوں کا مفہوم کیا ہے اور اس غیر مربوط استدلال سے موصوف کو فائدہ کیا ہوا اور یہ بھی دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اس چھ سات سطروں کی عبارت میں وہ قابل قدر جملہ کون ہے جس نے ملفوظ وارثی کی عبارت قطعی کو پر اسرار ثابت کر دیا۔

بلکہ انداز بحث سے تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ "من چہ می سرایم۔ وطنبورہ کا من چہ می سراید" کا مضمون ہے کہ مولف کے پیش کردہ دلائل کو مسئلہ زیر بحث سے کوئی تعلق نہیں اور بالفرض محال ان جملوں کے معنی اور مفہوم کو اگر بالکل صحیح مان لیا جائے تو بھی یہ بحث بدستور قایم رہتی ہے اس واسطے کہ مولف نے اپنے اس دعویٰ کی تائید میں کہ حضور کا ملفوظ پر اسرار ہے۔ یہ حجت پیش کی ہے کہ اگر (وہ الفاظ) خالی از اسرار ہوتے تو ہرگز اللہ تعالیٰ۔ سرکار مدینہ کی محبت کا اظہار اسی کلام پاک میں نہ فرماتا۔ اور یہ عشق وخلافت بزرگان دین کے خاندانوں میں جاری وقایم نہ ہوتا۔

اب قارئین۔ مولف کے دعویٰ اور دلیل کو انصاف کی نظر سے دیکھیں اور فرمائیں کہ اس حجت سے موصوف کا دعویٰ یعنی ہدایت وارثی کی عبارت سلیس کا پر اسرار ہونا کہاں تک ثابت ہوتا ہے یا موصوف کے دعویٰ کا مضمون کچھ اور ہے اور حجت کا کچھ اور یا دونوں مختلف المعنی اور جداگانہ حیثیت کے دو مضمون ہیں کہ نہ دعویٰ کو دلیل سے کوئی سروکار ہے نہ دلیل کو دعویٰ سے کوئی تعلق۔

میرے خیال میں مولف کے استدلال کی بلیغ عبارت اور دقیق مفہوم کا اپنے دعویٰ اور دلیل سے دست وگریبان ہونے کی سچی تعریف میں اگر کسی ظریف الطبع شخص کا یہ شعر پڑھ دیا جائے تو بہ لحاظ مناسبت مذاق بہت زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔

چہ خوش گفت است سعدی در زلیخا   الا یا ایہا الساقی ادر کاسا وناولہا

قطع نظر اس کے اگر اس پریشان تقریر کی تنقید لازمی منظور ہو تو بہتر یہ ہے کہ مولف ممدوح چونکہ حکیم بھی ہیں اور حکیم بھی دیرینہ۔ اور اس وقت کے حکیم ہیں جب نصاب طب عموماً عربی میں تھا۔ اور شاذ و نادر متعلم فارسی خواں ہوتے تھے اس لحاظ سے آپ کا شمار ارباب علم میں ہے۔ کیونکہ ایک فن کے آپ ضرور عالم ہوں گے اور مسئلہ زیر بحث بھی علمی اور اور مشرلی تھا۔ لیکن موصوف کی عنایت نے اس فروعات کی بحث میں اصولی اور مذہبی گفتگو بھی شامل کر دی ہے اس واسطے ضرورت ہے کہ اس مسئلہ میں ہمارا النصب العین وہ ہو جو سلف صالحین کا مذہب اور مجتہدین کا عقیدہ ہے۔

لہذا پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ مولف کے اس استدلال کی شق اول یہ ہے کہ "اگر (یہ الفاظ) خالی از اسرار ہوتے تو ہرگز خدائے تعالیٰ منزل عشق اور درجۂ خلافت کو اپنی ذات خاص پر مقدم نہ کرتا" اور تیسری شق یہ ہے کہ "اور اس منزل عشق و خلافت کا ذکر اپنے کلام میں نہ فرماتا۔

چنانچہ یہ شق سویم تو سراپا اس وجہ سے بے بنیاد ہے بلکہ صحت اور عدم صحت کا کیا ذکر اس کا وجود ہی مفقود ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کے موجودہ تیس پاروں میں تو لفظ عشق کا نام بھی نہیں ہے۔

شاید لائق مولف نے جس طرح اپنی کتاب میں غیر وقوع واقعات اکثر نقل کئے ہیں اسی طرح لفظ عشق کو جزو قرآن اس واسطے لکھ دیا کہ تھوڑی دیر کے لئے غلامان وارثی مشتبہ تو ہو ہی جائیں گے۔

اور شق اول کے مضامین سے بجائے مفاد کے مولف ممدوح کو ایسا ناقابل ذکر نقصان پہنچ گیا ہے جس سے دشمن کو بھی خدا محفوظ رکھے۔ کیونکہ الفاظ الحاد و ارتداد سے معمور ہیں۔

اس واسطے کہ عشق کے وہ اثرات جن کا وقوع پذیر ہونا لازمات سے ہے۔ اور

جن کی جہت سے عاشق کے حالات و عادات - حرکات و سکنات میں غیر معمولی تغیرات رد نما ہوتے ہیں۔ اور جن کا ذکر بعض ارباب طریقت نے اپنی کتابوں میں بکمال شرح و بسط نقل فرمایا ہے اور بالاجمال تو اکثر حضرات نے لکھا ہے جیسا کہ حضرت حافظ شیراز علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

روئے زرد است وآہ درد آلود　　　عاشقاں را گواہ رنجوری

اور عارف باللہ حضرت شرف الدین بو علی شاہ قلندر پانی پتی علیہ الرحمۃ نے فرمایا ہے۔

عاشقاں را شش نشاں ست اے پسر　　　آہ سرد و رنگ زرد و چشم تر
گر ترا پرسند دیگر کدام　　　کم خورد - کم گفتن و خفتن حرام

الغرض ان اثرات سے عقلاً و نقلاً ذات حضرت احدیت جل جلالہ پاک اور منزہ ہے اور یہ صفات رنجوری و مہجوری وغیرہ جس طرح عاشق مزاج بندوں کے حق میں اکثر استعمال کرتے ہیں۔ اور ایک حد تک ان کو ممتاز خطابات میں شمار کرتے ہیں اسی طرح ان اثرات کا ذات قادر مطلق سے منسوب کرنا اس کی شان جلالت اور صولت جبر ذتی کے صریح منافی ہے۔

چنانچہ علمار شریعت کا اتفاق ہے کہ حسب تعلیم قرآن مجید اللہ تبارک و تعالے کو محب کہہ سکتے ہیں لیکن عاشق کہنا از روئے عقائد کفر ہے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے شبان صحرائی کے الفاظ غیر مودب کو کفر فرمایا تھا جس کا ذکر مولانا علیہ الرحمۃ نے اپنی مثنوی میں بصراحت کیا ہے کہ

گفت موسیٰ ہائے خیرہ سر شدی　　　تو مسلمان ناشدہ کافر شدی

الغرض ہمارے مخاطب حکیم صاحب کی یہ ذاتی تجویز جس کو بصورت استدلال موصوف نے پیش کیا تھا اس کے اثر نے یہ کرشمہ دکھایا کہ بجائے ہدایت وارثی کو پر اسرار ثابت کرنے کے اپنے ہی موجد اور مجوز کے تجرد و تقدس کا ایسا تصفیہ کیا کہ حکیم صاحب کی خدافت کے ساتھ موصوف کی ارادت بھی کایا پلٹ ہوگئی بقول میر دہلوی نذر الٹی ہو گئیں سب

تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا"

لیکن سیاق تحریر کو دیکھتے ہیں تو مؤلف کے اس استدلال کے طرز مضامین سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ موصوف نے ہدایت وارثی کے الفاظ کو پراسرار ثابت کرنے میں تو خاموشی اختیار فرمائی اور بہ شکل تجاہل عارفانہ دبی دلیل جس کا ذکر بوضاحت اوپر ہو چکا ہے دوبارہ حمایت سجادگی میں پیش کر دی اور مکرر لکھدیا کہ خلافت چونکہ قایم کردہ حضرت احدیت ہے اس لئے جانشینی سے احتراز کرنا منشائے الہی سے انحراف کرنا ہے اور اشارہ یہ ہے کہ حضور قبلۂ عالم نے باقتضائے مشرب جو خلافت کی امتناع فرمائی تو درحقیقت فعل خداوندی کی تقلید سے انکار کیا۔ جو مذہبا جرم ثقیل ہے۔

حالانکہ بوضاحت لکھ چکا ہوں کہ جملہ افعال خداوندی کی تقلید بندوں پر واجب نہیں ہے بجز اس فعل کے جس کی اتباع کا حکم جلی ہو ورنہ افعال حضرت رب العزت متعدد ایسے ہیں جو بندے نہیں کرتے اور نہ کر سکتے ہیں۔

لہذا خدا نے آدم علیہ السلام کو خلیفہ ضرور کیا مگر اس کی تقلید کے واسطے بندوں کو مکلف نہیں فرمایا اور ایسا ہوتا تو ہر بندے پر واجب ہوتا کہ اپنا خلیفہ ضرور بنائے جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جملہ بنی آدم خلیفہ بھی ہوتے اور خلیفہ گر بھی۔

خلاصہ یہ کہ خلافت جس طرح صوفیائے متقدمین کی مستحسن یادگار ہے اسی طرح منجانب اللہ قطعی اور ضروری بھی نہیں ہے اس واسطے وہ خدا رسیدہ ہستیاں جن کو اپنے مسلک کے اعتبار سے خلافت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انھوں نے اس کو جاری رکھا اور جن کا مشرب محتاج خلافت نہ تھا انھوں نے خلافت کو اپنے واسطے غیر ضروری متصور فرمایا۔

لیکن خلافت کا قطعی اور غیر قطعی ہونا تو ایک طرف خلافت کی بحث میں بے سروپا مضامین نے جس طرح مولف موصوف کے تبحر کا پردہ فاش کر دیا۔ اسی طرح اس غیر مودب گفتگو نے آپ کے نہال تقدس کے بیخ و بن کو ایسا صدمہ پہنچایا جو بے برگ و بار ہو کر

آیندہ کی نشو و نما سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا۔

ارادت کی تعریف اس لئے کہ تقدس صرف ظاہری اعزاز نہیں۔ بلکہ باطنی گراں بہا امتیاز ہے جس کا تعلق صفائی قلب سے ہے اور حقیقی صفائی قلب مرید کے خلوص و ارادت اور پیر کی شفقت و عنایت پر موقوف ہے۔ مگر ہمارے مولف موصوف کو بہ لحاظ ستم ارادت اب اس کا استحقاق نہیں رہا کہ مرشد کی روحانیت سے مستفید اور بہرہ مند ہوں اس واسطے کہ پیر کے حکم قطعی سے ایسا صریح انحراف اور ایسے غیر مودب الفاظ میں کیا جس نے ارادت کو قطعاً تباہ و برباد کر دیا۔

حالانکہ حضرات صوفیائے کرام نے اپنے اپنے عہد میں بکمال وضاحت مسترشدین کو اگر کوئی ہدایت متواترا اور بالاصرار فرمائی ہے تو وہ ارادت کی نگاہداشت ہے کیونکہ مرید کی ارادت جس قدر استوار اور صدق و خلوص سے معمور ہوتی ہے اسی قدر پیر کی عنایت مبذول ہوتی ہے اور اپنی اخلاق سے وہ مرید کو آراستہ اور اپنی تادیب سے اس کو مودب بناتا ہے اور اپنے اشراق سے اس کے باطن کو روشن کرتا ہے۔

اور محققین ارباب طریقت نے ارادت کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ مرید کو پیر کے جمیع احوال میں بجز تسلیم و تصدیق کے انحراف اور اختلاف کا خیال بھی نہ آئے اور احکام پیر کے آگے معلومات و منقولات فنا اور اختیارات و احساسات ایسے معدوم ہو جائیں کہ اس پر تمثیل "کَالْمَیِّتِ بَیْنَ یَدِ الْغَسَّالِ" کا مضمون صادق آئے۔

چنانچہ سیدنا ابراہیم دسوقی القرشی علیہ الرحمۃ جو صاحب کرامات ظاہرہ اور مقامات فاخرہ تھے اور جن کا ۶۷۶ھ ہجری میں وصال ہوا ان کا قول ہے "رَاسُ مَالِ الْمُرِیْدِ الْمَحَبَّۃُ وَالتَّسْلِیْمُ وَالْقَاءُ عَصَا الْمُعَانَدَۃِ وَالْمُخَالَفَۃِ وَالسُّکُوْنُ تَحْتَ مُرَادِ شَیْخِہٖ وَاَمْرِہٖ"

(ترجمہ) مرید کا راس المال محبت اور تسلیم پیر ہے اور معاندت اور مخالفت کی سپر ڈال دینا ہے اور اپنے پیر کی مراد اور حکم کے تحت میں آرام لینا ہے۔ (طبقات الکبریٰ)

اسی ارشاد سے اگر استنباط کیا جائے تو مولف موصوف کی ارادت کالعدم اور اختلاف ثابت ہوتا ہے۔ اس واسطے کہ بجائے مخالفت کی سپر ڈالدینے کے آپ اعتراض کی تلوار لے کر پیر کے مقابلے کے لئے میدان انکار میں بغرض پیکار کھڑے ہیں۔ لہٰذا مسلم ہے کہ جس قلب کو معاندت اور مخالفت سے سروکار ہے اس کو ارادت اور محبت سے کیا تعلق

اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا۔

علیٰ ہذا۔ سہل بن عبداللہ تستری علیہ الرحمۃ جن کا وصال ۲۸۳ھ ہجری میں ہوا ان کا قول ہے۔ "اَلْمَحَبَّۃُ مُعَانَقَۃُ الطَّاعَاتِ وَمُبَایَنَۃُ الْمُخَالِفَاتِ" (ترجمہ) محبت کی تعریف یہ ہے کہ محبوب کی اطاعت کو گلے سے لگائے اور مخالفت سے احتراز کرے۔ (طبقات الکبریٰ)

اور طبقات الکبریٰ میں یہ بھی منقول ہے کہ حقیقت آگاہ ابو محمد رویم بغدادی علیہ الرحمۃ سے جن کا وصال ۳۳۰ھ ہجری میں ہوا۔ سائل نے محبت کی تعریف دریافت کی آپ نے فرمایا "اَلْمُوَافَقَۃُ فِیْ جَمِیْعِ الْاَحْوَالِ" یعنی جملہ احوال میں محبوب کی موافقت کا نام محبت ہے

اور احیاء العلوم میں ہے کہ حضرت یحییٰ بن معاذ علیہ الرحمۃ جو ۲۵۸ھ ہجری میں راہی ملک بقا ہوئے مریدین سے فرماتے تھے۔ "اَلْمَحَبَّۃُ اَلْعَمَلُ بِطَاعَۃِ الْمَحْبُوْبِ" کہ محبت صادق کی علامت محبوب کی فرمان برداری ہے۔

یہ ارشادات بالمعنی مرادف ہیں کہ پیر کی اطاعت اور موافقت کو عرف صوفیہ میں ارادت اور محبت کہتے ہیں اور چونکہ پیر کے فیضان باطنی سے مستفیض ہونے کا بہت بڑا ذریعہ ارادت ہے اس لحاظ سے صوفیائے کرام نے ہمیشہ طالبان حق کو ارادت پیر کی تاکید ہدایت فرمائی لیکن مؤلف موصوف اولیائے ذی صفات کے ان ہدایات کے اثرات سے بالضد متاثر ہوئے کہ بجائے اتحاد کے انحراف کو پسند کیا۔ اور موافقت پیر کی جگہ۔ مخالفت شیخ کو اچھا سمجھا اور اس خیال میں یہ غیر معمولی ترقی کی کہ پیر کے حکم قطعی کے خلاف ایک مستقل کتاب تالیف فرما کر شائع کر دی۔

اس کتاب میں یہ بھی لکھ دیا کہ آپ کا فعل آپ کے قول کے خلاف ہوتا ہے۔ چنانچہ صفحہ ۱۵۸ میں آپ لکھتے ہیں کہ " آپ نے فرمایا کہ ہماری منزل عشق ہے اس میں خلافت نہیں لیکن اس ارشادِ گرامی کا دوسرا پہلو ملاحظہ کیجئے تو بہت ہی واضح طور پر اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ آپ نے اپنے قول مبارک کے خلاف خود نظیریں پیش فرمائیں۔ اس سلسلہ کی سب سے زیادہ کھلی ہوئی یہ دلیل ہے آپ نے ایام وصال کے قریب خود سید محمد ابراہیم صاحب کو رام پور سے طلب فرمایا اور آپ کی طرف سے کچھ اس قسم کے اشارے نیز وصال کے بعد جو خاص تصرفات علم روحانی سید ابراہیم صاحب کے شریک حال ہوئے " وہی اس امر کے گواہ ہیں کہ حضرت سلطان الاولیاء نے اپنی حیات ہی میں حضرت سید محمد ابراہیم کو اپنا جانشین اور خلیفہ تجویز فرمایا تھا۔

مؤلف موصوف کی اس عبارت کا حصہ آخر خلاف واقعہ اور مشتمل بہ عدم صحت ہے جس کی صراحت آیندہ کروں گا۔ اس وقت صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ پیر کی معاندت اور مخالفت کی بحث بھی اس جملے کے آگے گرد ہو گئی اور تعجب معلوم ہوتا ہے کہ ایک پڑھے لکھے حلقہ بگوش نے بغیر کسی پس وپیش کے قلم برداشتہ یہ غیر مؤدبانہ جملہ کیونکر لکھ دیا کہ آپ نے اپنے قول کے خلاف خود نظیریں پیش فرمائیں۔

مہذب حضرات تو یہ الفاظ اپنے ہم مرتبہ شخص کی نسبت بھی لکھنا دستور آداب کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اور مشرب ارباب طریقت میں تو پیر کے غلام کے حق میں بھی اس مذموم صفت کا خیال کرنا نقص ایمان کی دلیل ہے۔

مگر یہ لحاظ ان اہل ارادت کے صدق وخلوص کا اقتضا ہے جن کو سرکار مبداء فیاض سے یہ توفیق تفویض ہوتی ہے کہ وہ حلقہ بگوش پیر طریقت کو خدا کی مجسم رحمت سمجھتے ہیں اور اس کی ذات ذی صفات کو برگزیدۂ حق و بہترین خلق جانتے ہیں اور لائق مؤلف سے یہ امید رکھنا گویا آگ سے پانی کا کام لینا ہے۔ خصوصاً یہ دیکھکر کہ موصوف قید ارادت

سے آزادی اور طوقِ مودت سے گلو خلاصی حاصل کر چکے ہیں ان سے یہ شکایت کہ پیر کو پیر کی حقیقی حیثیت سے نہیں دیکھتے بالکل بے محل فرمائش ہے بلکہ جملہ غلامان وارثی کو موصوف کے اس احسان عظیم اور الطاف عمیم کا شکر گذار رہنا چاہیئے کہ ہنوز پیر کے نام نامی کے ساتھ وہ لفظ سلطان الاولیاء لکھتے ہیں۔

حالانکہ مولف ممدوح نے اپنی اسی کتاب کے صفحہ ۱۴۶ میں لکھا ہے کہ حضرت مخدوم خواجہ عثمان ہارونی علیہ الرحمۃ نے فرمایا ہے کہ مرید کو چاہیئے کہ پیر کی زبان سے جو سنے اس پر ہوش کے ساتھ کان دھرے۔ یعنی بکمال خلوص اس کی تعمیل کرے لیکن باوجود اس علم کے موصوف کا عمل یہ ہے کہ پیر کا حکم قطعی پیر کی زبان سے سن کے نہایت بیباکی کے ساتھ فرماتے ہیں کہ آپ نے اپنے قول کے خلاف خود نظیریں پیش فرمائیں۔

اس اختلاف کی بنیاد۔ حمایت سجادگی کا غلو ہے۔ جس نے بجائے ارادت و مودت کے۔ مخالفت بلکہ مخاصمت کی بلند عمارت قایم کر دی۔ کہ ایسے غیر مودب الفاظ جو عقلاً و نقلاً پیر کی شان میں استعمال کرنا ممنوع ہیں ان کو اپنے قلم سے اپنے کارنامۂ عمل میں لکھکر اپنی آزادی کا اظہار کر دیا۔ فَاعْتَبِرُوْا يَا اُولِی الْاَبْصَارِ۔

اب سجادہ نواز مولف کی خدمت میں بطور اتمام حجت و اختتام بحث ایک التماس در کروں گا۔ جو صحیفۂ فسخ ارادت اور مجموعۂ انقطاع مودت کا آخر ورق ہے کہ بفرض محال حضور قبلۂ عالم کے حکم امتناع سجادگی کو بقول مولف موصوف۔ دستور مشائخین عظام کے خلاف تھوڑے عرصہ کے واسطے مان بھی لیا جائے تو اس صورت میں بھی مرید صادق کو باقتضائے حسن عقیدت اور بلحاظ مشرب ارباب طریقت اس حکم بھول کی بھی موافقت کرنا۔ اس وجہ سے ضروری اور لازمات سے ہے کہ حضرات صوفیائے کرام نے ارادت خاص کی حقیقی تعریف میں یہ فرمایا ہے۔ کہ اگر پیر کا کوئی فعل یا قول مشتمل بہ مکروہات بلکہ داخل ممنوعات معاذم ہو تو بھی مرید صادق کو بایں الفاظ اس کی اطاعت

سے اعراض نہ کرنا چاہیے کہ اگرچہ فرمان صورتاً صریح معیوب اور قبیح ہی کیوں نہ ہو مگر فی الحقیقت وہ مستحسن اور صحیح ضرور ہوتا ہے اس واسطے کہ حکم الحاکمین کے اس برگزیدہ لشکر کی زبان سے جو آواز نکلتی ہے وہ صفیر غیبی کی صحیح ترجمان ہوتی ہے بقول حافظ شیراز علیہ الرحمۃ۔

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند ۔۔۔۔۔۔ آنچہ استاد ازل گفت ہماں میگویم

چنانچہ کتب سیر کی ورق گردانی کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ سالک راہ حق سفر سیر و سلوک میں اگر اپنے درجات و مقامات کی شان و رفعت کو سہواً کبھی فخر و مباہات کی نظر سے دیکھتا ہے تو مادرائے التسداد ترقی پہلے اس کو وہ عقبات پیش آتے ہیں جن کے اثرات اور خصوصیات میں سے ہے کہ عوارض لاحقہ کا تصفیہ اور تخیل فاسدہ کا تزکیہ ملامت خلق کے پردہ میں ہو جائے تب جواہر منزل مقصود کے نشانات اور حدود درد کما ہوتے ہیں۔ اس لئے ان مقدس ہستیوں کے اخلاق حمیدہ کچھ عرصہ کے واسطے مبدل بہ صفاتِ قبیحہ نظر آتے ہیں۔

لیکن ان کے یہ احوال صعوبت خیز اور قباحت انگیز دیکھکر جو حلقہ بگوش خوش عقیدت اور حق نیوش ہوتے ہیں اور اپنی ارادت کو مستقل و استوار رکھتے ہیں وہ پیر کی غیر معمولی افادت سے مستفیض بھی ضرور ہوتے ہیں۔

جیساکہ حضرت شیخ صنعان کا مشہور واقعہ ہے کہ دوران سفر حج میں ایسی قبیح صورت پیش آئی جو بظاہر آپ کے تقدس کے منافی تھی۔ مگر حضرت فریدالدین عطار علیہ الرحمۃ نے اس بدنما حالت کی بھی بہ لحاظ ارادت پوری موافقت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج تک ان کی بوئے حقانیت سے مشام اہل حق مستفیض ہوتے ہیں۔

اس واسطے ارباب طریقت کا اتفاق ہے کہ مرید صادق کی ارادت واثق کا کمال یہ ہے کہ پیر کی حقانیت و للہیت کا ایسا یقین ہو کہ پیر کے احوال و اقوال کی نسبت ممنوع و غیر مشروع ہونے کا خیال بھی معدوم اور ناپید ہو جائے۔ اور بجز تسلیم اور تصدیق کے

اعراض واحتراز کا وسوسہ بھی نہ آئے۔ جیسا کہ حافظ شیراز علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید　　کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا

اس شعر میں حافظ صاحب نے اتباع احکام پیر کی وضاحت اس خوبی سے کی اور استدلال میں وہ بلیغ اہتمام فرمایا جس کے سامنے مریدین کے احساسات اور اختیارات کالعدم اور لاشی ہو گئے۔ خصوصاً تمثیل میں شراب اور سجادہ کے ذکر نے ایسی اہمیت پیدا کر دی کہ اب کسی توجیہ اور تفریع کی گنجایش نہیں رہی۔ اس واسطے کہ شراب جس کی نجاست شرعی اور حرمت قطعی نص صریح سے ثابت ہے۔

اور سجادہ نماز جس کی طہارت کلی کا اعتبار اور وثوق تیرہ فرائض نماز میں سے ایک فرض قطعی ہے جس کے بغیر نماز ناقص ہوتی ہے۔

ان دونوں کی متضاد حیثیت کو بالمقابل اور بالتفصیل حوالہ دینے سے یہ مضمون ہویدا ہو گیا۔ کہ پیر طریقت کا کوئی حکم گو بعید العقل اور منافی نقل ہی کیوں نہ ہو۔ مگر مرید کو بجز اطاعت کے کسی اعتراض و مخالفت کا حق ہی نہیں ہے۔

حتیٰ کہ رہنمائے کامل شراب سے جائے نماز رنگین کرنے کا کسی موقع کے لحاظ سے حکم صادر فرمائے جو صورتاً از روئے مذہب و مشرب صریح ممنوع اور قطعی مذموم فعل معلوم ہوتا ہے۔ تو بھی اس فرمان کی اطاعت و موافقت اس واسطے لازم ہے کہ یہ حق شناس گروہ طریق الی اللہ کے منازل و مراحل کے رسم و نظم تشیب و فراز سے کماحقہ خبردار ہوتا ہے۔ چنانچہ دنیا میں عام دستور ہے کہ وادی نادیدہ کارہ لوزد۔ اپنے رفیق طریق کی اتباع کرتا ہے تب منزل مقصود تک بآسانی پہنچتا ہے۔

الغرض مفتی شیراز کے اس فتویٰ سے کہ "بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید" اطاعت احکام شیخ کا وسیع میدان ظاہر ہو گیا اور اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضور قبلۂ عالم کا حکم امتناع سجادگی تو محدود حکم ہے کہ بجائے فرض اور سنت کے واجب بلکہ

مستوب کے ترک سے بھی اس کو تعلق نہیں۔ اور جس کو نہ منافی مذہب نہ خلل انداز مشرب کہہ سکتے ہیں بلکہ جس کی نسبت باوجود اس معاندت اور مخالفت کے مؤلف موصوف نے بھی اسی قدر عذر کیا کہ یہ ہدایت حضرات مشائخین کی سنت جاریہ کے خلاف ہے اور فی الواقعی یہ بجائے خود ایک اختلافی مسئلہ ہے کہ ایک گروہ نے تبلیغ خداشناسی کے واسطے اس کو وسیلہ گردانا ہے اور دوسری جماعت نے اس کو غیر ضروری سمجھا ہے یہ کسی نے نہیں کہا اور نہ کہہ سکتا ہے۔ کہ یہ ارشاد اعمال کے خلاف اور عقائد کے منافی ہے جس کے ارتکاب سے کسی گناہ صغیرہ یا کبیرہ کے سزاوار ہو جائیں گے۔

اس لئے صاف ظاہر ہے کہ "بہ مے سجادہ رنگین کن" کی اہمیت کے مقابلہ میں یہ ہدایت کہ ہماری منزل عشق ہے اس واسطے ہمارا کوئی جانشین نہیں، بہت معمولی حکم ہے جس کی تعمیل ہر خاص و عام کر سکتا ہے اور کسی ملت اور کسی مشرب کے علماء نے اس کو ناجائز اور ممنوع نہیں فرمایا ہے لیکن مؤلف موصوف نے اس معمولی فرمان کی اتباع سے روگردانی کرنے میں یہ نقصان اٹھایا کہ اپنے ارادت کی قدیم اور قیمتی عمارت کو اپنے ہاتھوں سے مسمار کر دیا۔

بعض واقعات کی تصحیح اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی سلسلہ میں اس کی بھی تصحیح ہو جائے کہ حضور قبلہ عالم نے سید محمد ابراہیم صاحب کو رلم پور سے بلایا اور لائق مؤلف نے جن الفاظ میں اس مضمون کو ادا کیا ہے اس کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا چنانچہ سابق الو صفت صفحہ ۱۸۶ میں بکمال فصاحت نقل فرماتے ہیں "اور منزل عشق کی خلافت نبوت جس کو خلافت کبریٰ کہتے ہیں اور خلافت راشدہ بھی کہتے ہیں " اگر خلافت نبوت کا خیال آپ کو قائم ہوتا اور خلافت ولایت جو خاتم الاولیا پر ختم ہوگی خیال نہ آتا تو " ہرگز ہرگز سید محمد ابراہیم صاحب جو کہ حضرت حاجی سید خادم علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حقیقی نواسہ اور حضرت سلطان الاولیاء کے حقیقی بھانجی کے صاحب زادے تھے۔ قاضی بخشش علی صاحب زمیندار گدیہ ضلع بارہ بنکی دو تنگ،" " شاہ صاحب وارثی رحمۃ اللہ علیہ

ومساۃ مبرن مبراثن ساکن نگو ضلع لکھنو لسی نجام ساکن دیوی شریف کو رامپو بھیجکر حافظ سید محمد ابراہیم کو بلوائے

قرینہ ہے کہ اس عبارت کی ترتیب لفظی اور ترکیب نحوی۔ طرز بلاغت اور حسن فصاحت

کو دیکھکر ناظرین بھی میرے ساتھ اس کا اعتراف فرمائیں گے کہ ہمارے عالی خیال مؤلف کا یہ

خاص حصہ ہے کہ انہوں نے اپنی مغلق تحریر کے بلند معنی جملوں میں اس مختصر مضمون کو کس خوبی سے بیان

کیا ہے کہ سرکار عالم پناہ نے چار معتمد اشخاص کا وفد جس میں ایک میراثن اور ایک حجام بھی تھا

بھیج کر رام پور سے سید محمد ابراہیم صاحب کو بلایا۔

اور مزید برآں نتیجہ کس قدر صحیح نکالا کہ اس واقعہ کو موصوف الصدر نے حضور قبلۂ عالم

کے حکم امتناع سجادگی کی تردید میں اس بحث کے ساتھ حجت گردانا ہے کہ اگر آپ کو اپنا

خلیفہ اور جانشین کرنا نہ ہوتا تو اپنی حقیقی ہمشیرہ صاحبہ کے نواسہ کو اس اہتمام بلیغ سے نہ بلاتے۔

لیکن اس واقعہ کی صحت اور عدم صحت کی تصریح سے پہلے یہ عرض بھر کردوں گا کہ دور اندیش

مؤلف نے باعتبار حفظ ما تقدم بطور اعلان صفحہ ۶۴ میں تحریر فرمایا ہے کہ یہ واضح رہے کہ

ان حالات کو جو دیگر حضرات تحریر میں لاچکے ہیں مکرر تحریر کرنا مناسب نہ سمجھ کر وہ واقعات

ضروری اور مصدقہ قلمبند کئے جاتے ہیں جن سے لوگ لاعلم ہیں۔

چنانچہ آپ کی اس پیش بندی کا اظہار اس واقعہ سے بخوبی ہوگیا اور اس اعلان کی

صداقت میں کوئی شک و شبہ نہ رہا۔ اس لئے صادق البیان مؤلف نے یہ قصہ ایسا

اچھوتا نقل کیا ہے جس سے بجز مؤلف کے تقریباً جملہ غلامان وارثی بے خبر اور لاعلم ہیں۔ اور

نہیں جانتے کہ اس وفد کے ممبران کب اور کیونکر منتخب ہوئے اور یہ وفد کس کی قیادت میں

روانہ ہوا۔ اور کیا کیا تحائف اس کے ساتھ بھیجے گئے۔

لائق مؤلف نے یہ اپنا مصدقہ واقعہ چونکہ بغیر کسی حوالہ کے ایسا پیش کیا ہے جو از روئے

قواعد علم کلام قابل استدلال نہ تھا۔ لیکن بایں ہمہ اقتضائے اخلاق یہ ہے کہ مؤلف

کی ہر ایک صحیح و غیر صحیح دلیل کا خیر مقدم کرنا چاہیئے۔

چنانچہ موصوف کا یہ جملہ آخر کہ اپنا خلیفہ اور جانشین کرنا منظور نہ ہوتا تو سید محمد ابراہیم صاحب کو اس اہتمام سے نہ بلاتے اس کی زیادہ صراحت کی ضرورت یہاں اس لئے نہیں معلوم ہوتی کہ امتناع خلافت کا تذکرہ بہ وضاحت ہو چکا ہے اور آیند بھی بعض واقعات میں اس کا ذکر آئے گا۔ مگر سید صاحب کی ذاتی شخصیت میں نہ کسی کو عذر ہے نہ ہو سکتا ہے کیونکہ آپ کی نسبت خاندانی اور شرفِ قرابت آپ کے اعزاز و عظمت کی ایسی کافی اور نمایاں دلیل ہے جس سے روگردانی کرنا انصاف اور دیانت کا خون کرنا ہے۔

لیکن قابل مؤلف نے جس عنوان سے اس واقعہ کو ضروری اور مصدقہ فرما کر اثبات وجوب سجادگی کی بحث میں بحیثیت دلیل قطعی بیان کیا ہے اس اعتبار سے اس کے وقوع اور عدم وقوع کا اظہار اور اس کی حقیقت و صداقت کا صاف لفظوں میں انکشاف ہو جانا بھی لازمی معلوم ہوتا ہے۔

اور یہ گفتگو چونکہ اس واقعہ کے وقوع سے وابستہ ہے اس لئے ضروری تھا کہ تحقیقات بھی چشم دید شہادت سے ہوتی۔ لیکن مؤلف نے کسی شاہد کا حوالہ نہیں دیا ورنہ اس واقعہ کو بحیثیت روایت دیکھتے اور راویوں کی ثقاہت کے اعتبار سے اس کی صحت اور عدم صحت کا اندازہ کیا جاتا۔

درآنحالیکہ موصوف نے اس واقعہ کو نہ دیدہ بیان کیا ہے نہ شنیدہ تو ایسی حالت میں یہ مسلم ہے کہ حسب قاعدہ تنقید ایسی مجہول خبر جو نہ دیدہ ہو نہ شنیدہ۔ لائق استدلال نہیں ہوتی۔ اور نہ قابل سماعت سمجھی جاتی ہے۔

لیکن باوجود ان جملہ نقائص کے موصوف نے اس واقعہ کو حکم امتناع سجادگی کے خلاف میں پیش کیا ہے اس واسطے خیال ہوتا ہے کہ اس بے اصول استدلال کی بھی تنقید ضرور کی جائے جو کم از کم دو مفاد سے خالی نہ ہوگی۔ اول یہ کہ واقعہ کی صداقت اور عدم صداقت کے ساتھ اس کا بھی اظہار ہو جائے گا کہ موصوف کی اصطلاح خاص میں

مقصد کس کو کہتے ہیں۔ دوئم یہ کہ قارئین کو اس واقعہ کے وقوع اور غیر وقوع سے مطلع ہو جانے کے بعد مولف کے نقل کردہ دیگر واقعات کی وقعت اور حقیقت کا اندازہ کرنے میں بہت زیادہ آسانی ہو جائے گی۔

اس واسطے گو یہ خبر واحد ہے مگر اس کی صحت اور عدم صحت کا معیار مولف کے اسی نقل کردہ بیان کو قرار دیا جائے۔ اور بعض کے الفاظ سے ان کے اس مصدقہ واقعہ کی تصدیق و تکذیب کا فیصلہ از روئے درایت کیا جائے۔

لہذا پہلے ان خدا شناس اخوان ملت سے جن کو رہنمائے کابل کی مزاج دانی کا شرف حاصل ہے یہ التماس کروں گا کہ بکمال غور و تامل ملاحظہ فرمائیں کہ اس واقعہ کو حضور قبلۂ عالم کی افتاد طبیعت سے کوئی مناسبت ہے یا نہیں۔ اس لئے کہ میں مردمیدان تفرید کا عین طریقہ تعلقات عالم سے انقطاع قطعی ہوا ور بہ اقتضائے زہد کامل جس نے تمام عمر کسی عزیز قریب سے خط و کتابت کرنے کا قصد بھی نہ فرمایا ہو اس مستغنی المزاج کا وفد بھیج کر کسی کو بلانا قرین قیاس ہو سکتا ہے یقین ہے کہ قدیم ارادتمندوں کی صحت آواز نفی میں آئیگی۔

بلکہ اس غیر معمولی عظمت و جلالت کے علاوہ سرکار عالم پناہ کی حیثیت، باعتبار رشتۂ قرابت بھی بزرگانہ تھی اس لحاظ سے بقول مؤلف اگر سید محمد ابراہیم صاحب کو بلانا مطلوب تھا تو اس کے واسطے آپ کا صرف حکم دینا کافی تھا نہ یہ کہ بہن کے نواسے کو بلانے کے لئے بکمال اہتمام وفد بھیجا گیا اس لئے روانگی وفد کا ذکر۔ عزیز غیر مربوط بلکہ خلاف عقل معلوم ہوتا ہے۔

قطع نظر اس کے وفد عموماً بموقع احتجاج۔ حکام اعلیٰ یا بہت ممتاز اشخاص کی خدمت میں اس وقت بھیجا جاتا ہے۔ جب کوئی اہم ضرورت پیش آتی ہے اس لئے وفد کے اصطلاحی معنی مجبوراً مگر امتیازی شکل میں عرضداشت پیش کرنا ہے لیکن خوش عقیدت مؤلف نے اپنے اس غیور مزاج رہنما کا مستدعی ہونا نقل کیا ہے جس نے تمام عمر اپنے غلاموں کو تنبا کینہ

ہدایت فرمائی ہے کہ سات فاقوں کے بعد بھی خدا سے طلب خواہشات کی استدعا نہ کرنا چاہیئے اور وہ بھی کس سے منسوب ہونا نقل کیا ہے۔ بہن کے نواسے سے اور کس واسطے استدعا کی۔ کہ ہمارے خلیفہ اور جانشین بن جاؤ۔ لہٰذا کوئی دانشمند اس کو نہیں تسلیم کرے گا کہ ایسا عبور نانا نواسے سے منسوب ہوا۔

الغرض حضور قبلہ عالم کے مزاج ہمایوں کا فطرتاً انداز اور اپنے مشرب خاص کی ہمہ وقت قابل نگہداشت کا ہرگز یہ اقتضا ہو نہیں سکتا کہ کسی حالت میں آپ کسی سے اشارۃً بھی استدعا فرماتے اس واسطے وفد کا تذکرہ قطعاً فرضی اور موضوع معلوم ہوتا ہے۔

علاوہ اسی کے ارکان وفد کے اسمائے گرامی کی فہرست کو اگر تعمق کی نظر سے دیکھئے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کسی ہوشیار اور کہنہ مشق مضمون نگار کا طبع زاد کرشمہ ہے کہ بظاہر سب کے نام بقید سکونت بکمال وضاحت نگارش کئے ہیں مگر درحقیقت جس طرح یہ وفد صریح بے بنیاد ہے اسی طرح ممبران وفد کے اسمائے گرامی فرضی اور قطعاً نام نہاد ہیں۔

جیسا کہ قاضی بخشش علی صاحب وارثی جن کو خادم بارگاہ وارثی بھی کہہ سکتے ہیں ورنہ آپ کا شمار مستقل حاضر باشوں کے زمرہ میں ضرور تھا۔ اور چونکہ موصوف میرے ہمعصر تھے اس واسطے مجھ سے بھی بہت زیادہ ارتباط تھا۔ اگر قاضی صاحب کو اس وفد کی شرکت کا اعزاز حاصل ہوتا تو کبھی تذکرہ ضرور کرتے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔

بلکہ برخلاف اسی کے یہ واقعہ پیش آیا کہ ایام میلہ کاتک میں آستانہ اقدس پر جسٹس سید شرف الدین کی تعمیر کردہ عمارت کے پائیں کے ایک کمرہ میں مولوی محمد یحییٰ صاحب وکیل رئیس عظیم آباد مقیم تھے اور اسی کمرے میں میرا بھی بستر تھا اور اسی کے آگے چھ بنی سہ درہ کے دالان میں سید محمد ابراہیم صاحب نے جب اول مرتبہ رامپور سے آئے تو قیام فرمایا اور چونکہ میرا بستر بہت قریب تھا اس لئے دوسرا وہ شخص جس سے جناب ممدوح

نے معانقہ کیا۔ وہ میں تھا۔ اور اس روز اکثر غلامان وارثی کو میں نے موصوف سے ملایا۔
اسی دوران میں برادرم قاضی بخشش علی صاحب آئے اور مجھ سے کہا کہ مجھے سید صاحب سے ملا دو۔ چنانچہ میں نے قاضی صاحب کا تعارف کرایا۔ سید صاحب نے بہت اخلاق سے معانقہ کیا اور فرمایا کہ مجھے بھی آپ سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔
اس گفتگو سے قاضی صاحب کا وفد کے ساتھ جانا اور رام پور سے سید محمد ابراہیم صاحب کو دیوی شریف لانا خلاف واقعہ ثابت ہو گیا۔ کیونکہ سید صاحب دیوی شریف آنے کے بعد قاضی صاحب سے روشناس ہوئے اور مصنف وفد نے آپ کا نام فرضی لکھا ہے۔
اسی قبیل سے یہ واقعہ بھی زبان حال سے شاہد ہے کہ ارکان وفد کے نام خود ساختہ ہیں۔ کیونکہ دوسرے روز صبح کو حسب دستور خدام کو ناشتہ تقسیم ہوا تو حاجی فیضو شاہ صاحب خادم خاص نے حاجی لبسی حجام کے ہاتھ سید صاحب کو ناشتہ بھیجا اور رحیم شاہ صاحب نے سید صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ یہ سید واڑہ کے قدیم نائی ہیں۔ سید صاحب نے خوش ہو کر ایک ادنیٰ چادر ان کو انعام میں دی اور فرمایا کہ الحمد اللہ۔ آج سید واڑہ کے حجام کو دیکھ لیا۔
اس واقعہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حاجی لبسی اگر وفد کے ہمراہ رامپور گئے ہوتے تو سید صاحب یہ نہ فرماتے کہ سید واڑہ کے حجام کو آج دیکھ لیا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ واقعہ جس نے تصنیف کیا ہو اس کے شرکائے وفد کے نام ایسے تجویز کئے جو نہایت موزوں ہیں۔
علاوہ اس کے مؤلف موصوف نے ترتیب وفد کی اس غلطی کو بھی نہیں دیکھا کہ مضمون نگار نے شاید بلحاظ زینت ارکان وفد میں مسماۃ میزن میراثن ساکن جگور کا نام بھی لکھ دیا ہے۔ حالانکہ مناسبت کے اعتبار سے یہ نام بھی ناموزوں یوں نہ تھا کہ رؤسائے قصبات کا دستور ہے کہ ایسے گفت و شنید کے موقع پر اکثر میراثی بھی ہمراہ جاتا ہے۔
مگر مصنف کی عدم معلومات نے اس کارروائی کا پردہ فاش کر دیا اور ظاہر ہو گیا کہ اس

وفد کی تنظیم قطعی خیالی ہے۔ اس واسطے کہ جس طرح میراثی کا ہمراہ جانا عام دستور میں داخل ہے اسی طرح یہ شرط بھی لازمی ہے کہ وہی میراثی جاتا ہے جو اس گھر کے خدمات بر بنائے میراث انجام دیتا ہے۔

چنانچہ سید واڑہ کے میراثی میاں حیدر تھے اور حضور قبلۂ عالم کے عہد ظاہری میں میاں حیدر نے ہمیشہ خدماتِ میراث انجام دیئے اور جملہ غلامانِ وارثی جانتے ہیں کہ آستانۂ اقدس کے میراثی حیدر تھے اور آج تک ان کی اولاد بکمال پابندی اپنے فرائض انجام دیتی ہے۔

برخلاف اسی کے مؤلف موصوف نے لکھدیا کہ میزن میراثن ساکن جگور وفد کے ساتھ رام پور گئی۔ حالانکہ میزن کو آستانۂ وارثی کی میراث سے کوئی تعلق نہ کبھی تھا نہ ہے بلکہ میزن کا نام بھی بارگاہِ وارثی کے کسی وابستہ نے نہیں سنا۔

لہٰذا یہ وفد اگر حضور قبلۂ عالم کے حکم سے جاتا تو میاں حیدر یا ان کے خاندان کا کوئی شخص بر بنائے میراث ہمراہ جاتا۔ لیکن بجائے اس کے بی میزن کا جانا بیان کیا جاتا ہے یہ عین دلیل ہے کہ یہ نام فرضی ہے اور جس طرح دیگر شرکائے وفد کے نام فرضی ہیں۔ اسی طرح یہ وفد مجسم خیالی ہے۔

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ مؤلف موصوف نے باوجود اپنی محدود معلومات کے (جس کا اندازہ قارئین کو عنقریب ہو جائے گا) اس واقعہ کا ذکر اپنے رسالہ میں چند مقامات پر کیا ہے لیکن دیگر مؤلفین سیرت وارثی جن کی واقفیت اس وجہ سے وسیع تھی کہ انھوں نے حضور کے حالات و واقعات دریافت کرنے میں پوری جدوجہد اور کافی کوشش فرمائی مگر اس اہم ترین واقعہ کی خبر ان کو نہیں ہوئی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر یہ واقعہ وقوع پذیر ہوتا تو ضرور تھا کہ وہ مؤلفین بھی آگاہ ہوتے اور اپنی اپنی تالیفات میں اس غیر معمولی واقعہ کو ضرور نقل کرتے۔

علی ہذا اگر وفد مذکور دیوی شریف سے روانہ ہوتا تو لازمات سے تھا کہ قصبہ کے ان مخصوص حضرات کو اس کے وجوہات اور انتظامات کا علم ہوتا۔ جو سرکار عالم پناہ کے قدیم خدمت گزار اور جان نثار تھے اور ہمیشہ آستانۂ اقدس کے معاملات میں تھوڑا یا بہت ان کے خدمات کو دخل ہوتا تھا۔ مگر وہ مقبولان بارگاہ وارثی بھی مؤلف کے اس مصدقہ واقعات سے اس قدر لاعلم تھے کہ اشارۃً بھی اس کا ذکر کبھی نہیں کیا۔

اس لئے ثابت ہوتا ہے کہ اس نوایجاد وفد کی حقیقت کو اس کہانی سے بلحاظ بہت زیادہ مناسبت ہے جو بچوں کو سلانے کے وقت ان کی کھلائی کہتی ہے۔

اس سے بھی زیادہ حیرت خیز امر یہ ہے کہ وہ ارادت مند جو اپنے گھروں کو چھوڑ کر مستقل طور پر ہمہ وقت حاضر باش اور شبانہ روز پیشوائے برحق کے خدمات میں مصروف رہتے تھے مگر وفد کی روانگی کا ایسا گہرا راز تھا جس کی سماعت سے ان کے بھی کان آشنا نہیں ہوئے اور نہ یہ دیکھا کہ کب اور کس دروازہ سے ہر سہ اشخاص بی بیزن کو لے کر رام پور چلے گئے۔

حتیٰ کہ فیضو شاہ صاحب جو اس زمانہ میں حضور قبلۂ عالم کے خادم خاص تھے ان کو بھی اس واقعہ کا علم نہیں ہوا اور یہ ان کی لاعلمی اس واقعہ کے غیر وقوع ہونے کا اس لئے بڑا ثبوت ہے کہ اگر سرکار عالم پناہ کے حکم سے یہ لوگ رام پور جاتے تو لازمات سے تھا کہ ان کے زاد سفر کا انتظام فیضو شاہ کرتے مگر ایسا نہیں ہوا۔

بلکہ برادرم سید محمد وق شاہ صاحب وارثی متوطن عظیم آباد سے جو عرصہ سے منجانب ٹرسٹ خدمت آستانۂ اقدس کے لئے مامور ہیں۔ بخیال مزید احتیاط میں نے عرض کیا کہ آپ بھی اس واقعہ کی حقیقت فیضو شاہ صاحب سے دریافت کیجئے چنانچہ موصوف نے چند فقرائے تہبند پوش اور بعض زائرین کے روبرو فیضو شاہ صاحب سے اس واقعہ کی صحت اور عدم صحت کا استفسار کیا۔

فیض شاہ نے برجستہ فرمایا کہ یہ واقعہ بالکل غلط ہے اور تیم صفدر کی کتاب پڑھنے کے لائق نہیں۔ اور اسی سلسلہ میں بعض دیگر واقعات ایسے بیان کئے جن کا اعادہ اس موقع پر بے محل ہے۔ اگر ضرورت ہوگی تو آیندہ گذارش کروں گا۔

الغرض توضیحات مذکورہ سے ثابت ہوتا ہے کہ لائق مولف کا نقل کردہ یہ واقعہ بوجہ عدم صحت قابل تسلیم نہیں ہے۔ کیونکہ نہ دیگر مولفین سیرت وارثی نے لکھا۔ نہ روسائے قصبہ شاہد ہیں۔ نہ خدام آستانہ کو خبر ہے۔ نہ خادم خاص کو علم ہوا۔ صرف مولف موصوف کا بیان ہے وہ بھی بغیر کسی حوالے۔ لہذا ایسی خبر واحد اور ایسے اہم مسئلہ کے واسطے جس کو مشربی عقائد سے خاص تعلق ہے کیونکر قابل تسلیم ہو سکتی ہے۔

لیکن یہ معما کہ جملہ وابستگان بارگاہ وارثی کا اس اہم ترین واقعہ سے خبردار نہ ہونا۔ اور بارہ میل کے فاصلہ پر مولف موصوف کا دفد کی روانگی سے مطلع ہونا۔ گو بظاہر عقل کے صریح خلاف ہے مگر ہم اپنے راستباز مولف کی شہادت کو بے بنیاد بھی نہیں کہہ سکتے۔ اس واسطے تطابق یوں ہو سکتا ہے کہ شاید مولف نے یہ واقعہ عالم رویا میں دیکھا ہوگا اسلئے آپ کا مصدقہ فرمانا بھی بجائے خود درست ہے اور جملہ غلامان وارثی کا لاعلم ہونا بھی صحیح ہے۔

لہذا اس مختصر تنقید سے مولف موصوف کے مصدقہ دفد کی حقیقت کا حبب کہ بخوبی انکشاف ہو گیا تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی سلسلہ میں اس کا بھی ذکر کر دیا جائے کہ۔ سید محمد ابراہیم صاحب کا پہلی مرتبہ رام پور سے کب اور کس تقریب سے آنا ہوا۔ اس واسطے کہ شاید ممدوح کو اس کے قبل دیوی شریف آنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ بلکہ بعض اسباب قدرتاً ایسے لاحق ہو گئے تھے کہ خاندانی رسم و راہ کا سلسلہ عرصہ دراز تک موقوف رہا چنانچہ منجملہ دیگر اسباب کے دو سبب زیادہ نمایاں معلوم ہوتے ہیں۔

اول وہ قریبی رشتہ جو آمد و رفت کا خاص اور بہت بڑا ذریعہ ہو سکتا ہے وہ ... قبلہ عالم کی ذات بابرکات کے ساتھ تھا لیکن وہ اس لحاظ سے بیکار ہو گیا کہ جناب حضرت کے

عنفوان شباب سے بہ اقتضائے زہد کامل اور باعتبار قیود و مشرب دنیا و ما فیہا سے سروکار نہ رہا۔ ایسی حالت میں خاندانی ارتباط کیونکر قایم رہ سکتا تھا۔ اگر کلیتہً اور بحد اتمام آپ تعلقات عالم سے انقطاع قطعی نہ فرماتے تو اقربا کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی منقطع نہ ہو جاتا۔

علاوہ اس کے سید صاحب موصوف کی آمد و رفت میں مدت مدید تک رکاوٹ قایم رہنے کا دوسرا سبب یہ ہوا کہ محمود الصفات حضرت حاجی سید خادم علی شاہ صاحب اعلی اللہ مقامہ جب وطن مالوف سے کنارہ کش ہو کر لکھنؤ میں ہمیشہ کے لئے قیام فرما ہوئے تو اس مستقل مہاجرت کا اثر یہی ہونا لازم تھا کہ اس ارتباط یگانگت میں ضرور کچھ کمی ہو جائے۔ جو دوستش بدوش رہنے کا نتیجہ ہوتا ہے اور مزید برآں بعد وصال حضرت سیدنا قدس سرہٗ آپ کی اہلیہ صاحبزادیوں کا عقد نکاح فرما کر حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئیں اور لکھنؤ میں کوئی نہ رہا تو یہ انقلاب عظیم ایسا پیش آیا کہ رفتہ رفتہ ارباب برادری اس قدر غیر مانوس ہو گئے کہ اس نصف صدی میں قرینہ ہے کہ شادی اور غمی کے متعدد واقعات اور حادثات رونما ہوئے ہوں گے مگر طرفین کے دلوں سے اعزا کی یاد ایسی فراموش ہو گئی تھی کہ تہنیت اور تعزیت کا خط بھی ایک نے دوسرے کو نہیں لکھا باوجودیکہ اہل برادری کو بخوبی معلوم تھا کہ سیدنا حاجی سید خادم علی شاہ صاحب کی بڑی صاحبزادی سیدہ بی بی مقبول النسار صاحبہ رامپور میں اپنے بیٹے سید محمد ابراہیم صاحب کے ساتھ رہتی ہیں جو ریاست کے وکیل بھی ہیں۔

لیکن اس تفرقہ کے بعد جامع المتفرقین نے برسوں کی دور افتادہ ہستیوں کو جب ملا دینا منظور فرمایا تو خلاف امید یہ صورت پیش آئی کہ قصبہ کے مشہور رئیس مولوی فخر الدین احمد صاحب نے اپنے بڑے صاحبزادے مولوی فرید الدین احمد صاحب کی شادی میں بکمال اولو العزمی یہ انتظام کیا کہ ماسوائے ارباب برادری کے قرب و جوار کے مقتدر اور ممتاز حضرات کو بھی مدعو کیا۔ بلکہ یہ اہتمام بھی فرمایا کہ وہ اہل قرابت جو عرصہ بعید سے وطن مالوف کو خیرآباد کہکر دوسرے شہروں میں بالاستقلال آباد ہو گئے تھے۔ اور کسی وجہ سے

برادرانہ رسم و راہ کی پابندی موقوف ہو چکی تھی ان کو بھی باصرار بلیغ بلایا اور بعد مدت کے پژمردہ شدہ اس نخل یگانگت کو از سر نو تازہ کیا۔

از آنجملہ سید صاحب موصوف کی والدۂ مکرمہ کو بھی اسی عجز و فقار کے ساتھ مدعو کیا۔ جو خاندانی حیثیت سے ممدوحہ کے شایان شان تھا۔ اور برادرانہ برتاؤ کے لحاظ سے موصوفہ بھی معہ اپنے صاحبزادے سید محمد ابراہیم صاحب کے تشریف لائیں اور شادی کے جملہ مراسم میں اسی طرح شرکت فرمائی جو ایک عزیز قریب کا فرض ہوتا ہے۔ مگر سید صاحب گو شادی کے مخصوص مراسم میں شریک ہونے سے رہے لیکن قیام آستانہ پر فرمایا۔ حالانکہ میلہ کاتک کی وجہ سے زائرین کا اژدہام تھا۔ اور کافی آرام نہیں ملا مگر آپ نے اس تکلیف کو بھی بخوبی گوارا کیا اور تقریباً دو ہفتے کے بعد والدۂ معظمہ کے ہمراہ رام پور واپس گئے اس وقت سے آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہو گیا۔

الحاصل کسی وجہ سے کیوں نہ ہو مگر غیر مستند راویوں نے اس واقعہ کی اصلی صورت کو سراپا بدل دیا اور مولف جلوۂ وارث نے بھی نہ اس واقعہ کی حقیقت دریافت فرمائی اور نہ درایت کی تکلیف گوارا کی اور ایسی غیر مربوط عنوان سے اس واقعہ کو نقل کر دیا۔ جو پیشوائے برحق کے مسلک و مشرب کے صریح منافی تھا۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ اسی ایک واقعہ پر موقوف نہیں ہے۔ لائق مؤلف کے نقل کردہ واقعات میں عموماً یہ نقائص ہیں کہ بعض بوجہ عدم دلائل کے ایسے مجہول ہیں جن پر موضوع ہونے کا اطلاق ہو سکتا ہے بعض غیر معروف اس قدر ہیں کہ ان کی تصحیح ناممکن ہے۔ بعض خارج الاسناد ایسے ہیں کہ جن کی صحت پر ارباب ہوش ذرا کا صاد نہ کریں گے۔

اور یہ نقص تو قریب قریب ہر واقعہ میں نظر آتا ہے کہ ان کے سطحی دلائل اور ناتمام مضامین کی ضعیف اور گری ہوئی حالت کا ایسی معمولی اور کمزور حیثیت دکھائی دیتی ہے جیسے عوام الناس سنی سنائی باتیں آپس میں کرتے ہیں۔ حالانکہ ان واقعات کے بعض حصص اگر

صحیح بھی ہوتے ہیں۔ تو بھی محققانہ شان نہ ہونے سے کم از کم مؤلف کی عدم واقفیت اور محدود معلومات کا صاف اظہار ہوتا ہے۔

مثلاً مؤلف نے صفحہ ۹۵ میں حضور قبلۂ عالم کے خدام خاص کی تفصیل میں دائم علی شاہ صاحب، رحیم شاہ صاحب، بدنام شاہ صاحب، نور محمد شاہ صاحب، فیضو شاہ صاحب اڑاڑ و شاہ صاحب کے نام نامی بکمال وضاحت تسطیر فرمائے ہیں اور درحقیقت خدام وارثی کے اسمائے گرامی صحیح بھی ہیں۔ صرف اڑاڑ و شاہ کا نام اس زمرہ میں بالکل غلط ہے یہ حضور قبلۂ عالم کے فقیر تہبند پوش ضرور تھے مگر خادم خاص کے عہدہ پر کبھی معمور نہیں ہوئے لہٰذا مولف موصوف کی غیر محققانہ معلومات کا یہ اقتضا ہے کہ خلاف واقعہ اڑاڑ و شاہ صاحب کا نام خدام خاص کی فہرست میں لکھ دیا۔

قطع نظر اس کے خدام خاص کے عہد خدمات کی یہ معکوس اصلاح فرمائی ہے کہ جو مقدم تھے ان کو موخر اور جو موخر تھے ان کو مقدم کر دیا ہے۔ اور اس کا تو صراحتاً بھی ذکر نہیں کیا کہ خدام اس منصب جلیلہ پر کب اور کیونکر سرفراز ہوئے اور کون اس عہدہ خاص پر کتنے عرصہ تک معمور رہا۔

اس واقعہ سے بھی مؤلف کی عدم واقفیت کا کافی اظہار ہوتا ہے اور آپ کی یہ تحریر زبان حال سے شاہد ہے کہ عوام الناس کی زبانی سنی ہوئی خبروں کو آپ مصدقہ واقعات سے تعبیر فرماتے ہیں۔

علیٰ ہذا صفحہ ۱۰۱ میں مؤلف نے باریوں کا ذکر کیا ہے۔ اور حضور قبلۂ عالم کے قدیم خدمت گزاروں کے نام نامی اور بعدہٗ چھ تعلقداروں کے اسمائے گرامی جو نقل فرمائے ہیں وہ کلیتہً صحیح ہیں۔ لیکن سرسری نظر سے بھی اگر دیکھا جائے تو باعتبار حقیقت حال مؤلف کی محدود معلومات کا نمایاں طور پر انکشاف ہوتا ہے۔

اس واسطے کہ آپ لکھتے ہیں کہ حضرت سلطان الاولیا۔ شیخ غلام علی صاحب سے ناراض

ہو گئے اور باری بند کرادی۔ یہ بیان خلاف واقعہ اس وجہ سے ہے کہ شیخ غلام علی صاحب عرف گھسیٹے میاں کا انتقال ۱۸۹۲ئ میں ہوا۔ا دران کے بعد مرحوم کی دختر نیک اختر نے اس خدمت کو عرصہ تک انجام دیا۔

پھر موصوف نے لکھا ہے کہ "چھ تعلقداروں نے صدق دل سے اپنے اپنے اخراجات سے دو دو ماہ کی باریاں مقرر کر دیں۔ یہ قصہ گو صحیح ہے مگر جس عنوان سے لکھا ہے وہ صراحت کا محتاج ہے کیونکہ یہ باریاں بوجوہ اور مختلف اوقات میں مقرر ہوئیں نہ کہ بیک وقت۔

پہلے صرف بادشاہ حسین خاں صاحب وارثی عرصہ تک خدمت گزار رہے بعدہٗ عباس حسین خان صاحب وارثی اور چودہری لطافت حسین خان صاحب وارثی بھی شریک ہوئے اور ہر سہ حضرات کو چار چار ماہ کی خدمت تفویض ہوئی۔ اور ایک سال کے بعد راجہ دوست محمد خاں صاحب وارثی بھی مسند عی ہوئے اور چاروں حضرات کو تین تین ماہ کی خدمت مل گئی۔ کچھ عرصے کے بعد راجہ شیر محمد خان صاحب وارثی اور تین سال کے بعد راجہ اودت نرائن سنگھ صاحب وارثی بھی شریک ہوئے اور اس وقت سے دو دو ماہ کی خدمت تقسیم ہو گئی۔

یا دیوی شریف میں حضور قبلۂ عالم کے قیام کے واسطے جو مکان مخصوص تھا۔ اس کا نقشہ بیان کرنے میں پرزور لہجے کے ساتھ صفحہ ۹۸ میں مؤلف موصوف نے لکھا ہے کہ پورب جانب کی صحنچی میں پختہ قدمچہ بنا تھا۔ اس سے موصوف کی ضعیف معلومات کا اندازہ ہوتا ہے کہ عوام سے سنی ہوئی بات ہے جس کو مصدقہ کہکر لکھدیا ہے اور حقیقت حال سے واقفیت نہیں ہے۔ کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ اس صحنچی میں چھوٹی سی ایک چوکی استنجے کے واسطے رکھدی تھی۔

الحاصل لائق مؤلف نے اکثر واقعات کا ذکر اسی طریقہ سے کیا ہے جن کے مطالعہ سے آپ کی محدود واقفیت کا اظہار ہوتا ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ سنی سنائی باتوں

کو موصوف نے قلمبند کیا ہے حالانکہ ان سے علمی واقعات کا مشرب پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اسی واسطے میں نے تمثیلاً ذکر کیا ہے کہ ناظرین واقف ہو جائیں کہ ممدوح نے کیسے کیسے واقعات کو مصدقہ فرمایا ہے۔

چنانچہ جس طرح مؤلف موصوف کی اس تالیف منیف کا کوئی واقعہ مجہول یا غیر معروف اور کوئی تشنہ اور ناتمام نظر آتا ہے۔ اسی طرح آپ کی انشاپردازی کی بھی انوکھی شان ہے جو سلاست اور فصاحت کے حدود و قیود سے سراپا بے نیاز ہے۔ بلکہ آپ کی مقفیٰ اور مسجع عبارت کا یہ انداز بھی اپنی نظیر آپ ہے کہ اکثر جملوں کا مفہوم سمجھنا دشواری سے خالی نہیں ہوتا۔

تنقید کلام منظوم | اور اس بے عدیل صفت سے آپ کی عبارت نثر ہی موصوف نہیں ہے بلکہ آپ کا کلام منظوم بھی اس خوبی سے معمور ہے۔ کیونکہ ماشاء اللہ آپ شاعر بھی ہیں اور صفا تخلص کرتے ہیں۔ اور اپنا منتخب اور مایہ ناز کلام اپنی کتاب میں بطور نمائش اکثر مقام پر ارقام فرمایا ہے۔

لہٰذا مثال کی صورت سے مؤلف موصوف کے بعض برجستہ اشعار نقل کرتا ہوں چنانچہ حضور قبلۂ عالم کی تقریب دستاربندی کے ذکر میں بطور تہنیت یہ رباعی جس کو آپ کی طبع موزوں کا معرکۃ الآرا کارنامہ کہنا بے محل نہ ہو گا صفحہ ۱۶۱ میں تحریر فرماتے ہیں۔

مُبارک ہو یہ دستار مبارک شاہ وارث پر | یہ ہیں وارث علی شاہ ولایت شاہ وارث پر
یہی تو سر دلبستانِ محمدؐ اور علی کے ہیں | حسین و فاطمہ کے جلوہ آرا شاہ وارث پر

یہ عدیم النظیر قطعہ چونکہ مدحت میں ہے اور دستور ہے کہ مدحت کسی زبان اور کسی عنوان سے ہو اس کا صلہ مداح کی صداقت بیانی اور ممدوح کی عنایت و مہربانی پر موقوف ہوتا ہے اور یہ بھی مسلمہ ہے کہ اگر مدحت مشتمل بر خلوص و ارادت ہو تو مداح اس کی جزا کا ضرور مستحق ہوتا ہے۔

لیکن اس باب میں میرا نقطۂ نظر نفس مضامین کی تنقید ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ صرف انھیں قواعد علمی سے بحث کرنا مقصود ہے جن کی پابندی کا لحاظ رکھنا حضرات ناظمین کے واسطے ارباب علم عروض نے لازمی گردانا ہے۔

چنانچہ دیکھتے ہیں کہ شعرائے متقدمین جنھوں نے ضوابط عروض کی پوری تعمیل اور کامل اتباع کی ہے ان کا کلام اس قدر مستند اور قابل اعتبار مانا جاتا ہے کہ اہل ادب ان کے اقوال بحث اور استدلال میں پیش کرتے ہیں۔

لیکن مؤلف موصوف کی اس بے عدیل رباعی کی چوصدی کو سرسری نظر سے بھی دیکھا جائے تو بجائے ان قواعد عروض کی پابندیوں کے خود موصوف ہی کے اجتہادی اصول سے مملو نظر آتی ہے اور نمایاں طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح سنہ ہجری کی اس چودھویں صدی کا آفتاب جب قریب نصف النہار پہنچا اور اہل ہند کے مضمحل شدہ طبائع میں قدرتاً یہ ہیجان پیدا ہوا کہ ہر فرد کو شخصیت کے جوش نے ایسا مرد میدان بنا دیا کہ قید اطاعت سے بیزار ہو کر اپنی فطرتی میراث یعنی کامل آزادی کا طلبگار رہا۔

اسی طرح عالی خیال مولف کی جدت پسند طبیعت نے عروض کے بوسیدہ اوراق کی تقلید کے طوق گراں سے اپنی گردن کو سبکبار کیا۔ بلکہ استعارات و تشبیہات سے جن کو آورد سے واسطہ اور تکلفات سے سروکار ہے دست بردار ہو کر بالکل سادہ مگر خود ساختہ اور انوکھا رنگ اختیار کیا۔ حتیٰ کہ نشست الفاظ کی قید بھی آپ کے مطلق العنان خیال کو ایسی ناگوار ہوئی اور صحت معنی کا دوسرا بیکار نظر آیا۔ اس لئے تنظیم اشعار میں یہ بے تکلف اور آزادانہ طریقہ پسند فرمایا کہ بغیر کسی غور اور فکر کے جس لفظ کو جہاں چاہا قلم برداشتہ لکھدیا اور جو حرف اس کا زائد نظر آیا اس کو محذوف سمجھا اور چند بے کاوک جملوں کے مجموعہ کو شعر بلکہ شیر نیستاں جانا۔ چنانچہ انھیں صفات سے یہ رباعی سراپا موصوف ہے اس واسطے اگر اس کو موصوف کی طبع موزوں کا اجتہاد کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

غرض ایسی مرصع رباعی سے جو سراپا آزادی کے قیمتی زیورات سے آراستہ ہے روشناس ہو جانے کے بعد اس کی ضرورت نہ تھی کہ حضرت صفا کے دیگر اشعار تمثیلاً نگارش کرتا مگر شاید میری طرح ناظرین کو بھی سیری نہ ہوئی ہو گی اس خیال سے موصوف کی دوسری نعتیہ غزل جو صفحہ ۱۲ میں مسطور ہے اس کے دو شعر نگارش کرتا ہوں ملاحظہ ہوں۔

شکرانہ میں دونگا جو کچھ ہے میری ملکیت — پھر خدا کہدے تو پھر احمد محمد مصطفےٰ

جاں تجھکو دوں دل ایمان دوں جو کچھ تو مانگے تجھکو دوں — ایک بار پیارے پھر تو کہہ احمد محمد مصطفےٰ

یہ دونوں شعر بھی موصوف کی اسی خانہ ساز صنعت سے معمور ہیں کہ تمام قیود سے آزاد اور جملہ لکافات سے معرا خدانخواستہ نہ قافیہ کی پابندی نہ غبار صحت سے الفاظ کا شفاف دامن آلودہ ہے۔ اور فی الحقیقت یہ اشعار بھی باعتبار صفات شاعری ایسا بلند پایہ رکھتے ہیں جن کا کسی شاعر کے کلام سے موازنہ کرنا میرے خیال میں گناہ کبیرہ سے دو ا بچند بڑا جرم ہو گا۔ کیونکہ یہ ذہنیت نہ غالب کو نصیب ہوئی نہ یہ صفت میر کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ بلکہ سچ پوچھو تو ایسے اچھوتے رنگ میں اور ایسے سلیس اور مرصع اشعار لکھنا ہمارے باصفا مؤلف ہی کا کام ہے۔

بلکہ غور سے دیکھتے ہیں تو صفحات تاریخ زبان حال سے شاہد ہیں کہ میدان شاعری کا پہلا سیاح اور علم عروض کا موجد اور مدون خلیل بن احمد بھی ہے جس کو ناز تھا کہ میں نے اپنے الہامی علم سے پندرہ بحریں ایسی مستخرج کی ہیں جو ایوان شاعری کے بام بلند کا استوار زینہ ہے۔

علیٰ ہذا جب سرزمین ایران میں علامہ ابوالحسن خفش پیدا ہوا۔ جو علم عروض کا مکمل عالم تھا تو اس کے اجتہاد کا یہ بہت بڑا کارنامہ شمار کیا جاتا تھا کہ اس نے سولھویں بحر متدارک ایجاد کی۔ اور کچھ عرصے کے بعد چند شعرائے عجم نے جو فن شاعری کے بہترین ماہر تھے۔ جب یہ تین بحریں جدید قریب و مشاکل مستخرج فرمائیں تو وہ دنیائے عروض کے حکمران مشہور ہو گئے۔

اور مورخین نے ان کا نام مجتہدین کی فہرست میں لکھا۔

غرض انھیں انیس بحروں پر شاعری کی بنیاد قایم ہوئی۔ اور اسی مستحکم بنیاد پر شعرائے متقدمین نے ہزاروں خوشنما اور عالی شان عمارتیں بنائیں اور آج تک انھیں بحروں کی استعانت سے ناظمین جب اپنے تخیلات کا اظہار کرتے ہیں تو ان کے جذبات کی وہ صحیح تصویر ہوتی ہے۔

اور انھیں انیس بحروں کو کسی شاعر نے منظوم دائرہ میں محدود کر دیا ہے۔ وہو ہذا

رجز خفیف و رمل منسرح دگر مجتث   بسیط و وافر و کامل ہزج طویل و جدید

مشاکل و متقارب سریع و مقتضب ست   مضارع و متدارک قریب و نیز مدید

لیکن تعجب اس کا تھا کہ زمانہ کا یہ دور ترقی کہ ہر گوشے سے روزانہ ایجاد و اختراع کی خوشگوار آوازیں آتی ہیں مگر مدت مدید سے فن شاعری کے نصاب و اصول میں کوئی تجدید نہیں ہوتی۔

اور یہ خبر نہ تھی کہ قدرت نے ایک شخص کو پیدا کیا ہے جو شاعری کے بوسیدہ اصول کو از سر نو تازہ کرے گا اور اس کے محدود قواعد کو اوج اہتمام و اختتام سے بالا اور بلند کر دے گا۔

چنانچہ وہی صورت پیش آئی کہ لائق مولف موجودہ اور محدود عروض کے دام تقلید سے قطعاً آزاد ہیں اور آپ کی شاعری کا انھیں مذکورہ چند بحروں پر انحصار نہیں ہے۔ حالانکہ ممدوح الصفات ایک گاؤں کے باشندہ اور غیر معروف شاعر ہیں۔ مگر آپ کی جدت پسند طبیعت کا یہ عجیب کرشمہ ہے کہ نہایت خاموشی کے ساتھ شاعری کے اس تنگ و تاریک راستہ کو غایت وسیع اور کشادہ کر دیا۔ اور متعدد بحریں ایسی صاف و شفاف ایجاد فرمائیں جن کا نہ خواجہ نصیر الدین طوسی کے رسالہ معیار الاشعار میں ذکر ہے نہ ملا محمد بن القیس مصنف حدائق العجم " کا ذہن رسا ان کو دریافت کر سکا۔

اور لائق مولف آنکھ بند کر کے اپنی خانہ ساز بحروں میں جن کا نام بھی کسی اہل عروض کو معلوم نہیں۔ ایسے ایسے برجستہ مگر مغلق شعر کہتے ہیں جن کے معنی اور مطالب سمجھنے میں موجودہ

شاعر نامر ہیں۔

قطع نظر اس کے شعر گوئی کا یہ طریقہ بھی شاید آپ ہی کا ایجاد کردہ ہے جو بہت آسان بھی ہے اور اپنی نوعیت اور خصوصیت میں فرد بھی ہے کہ پوری غزل کے اشعار اگر بجائے ایک بحر کے چند بحروں میں لکھے جائیں تو وہ غزل اپنی اس صنعت کے اعتبار سے لاجواب غزل سمجھی جائے۔

بلکہ غزل کا ہر مصرعہ اگر جداگانہ بحر میں ہو تو شاعر کی معلومات گوناگوں کی عین دلیل ہے۔ چنانچہ شاید اسی وجہ سے مؤلف کے ہر دو اشعار مذکورہ کا ہر مصرع اپنے ساتھ کے دوسرے مصرع سے وزن میں بھی ہلکا یا بھاری اور عرض و طول میں بھی لمبا یا چوڑا نظر آتا ہے۔۔

علی ہذا لائق مؤلف صفحہ ۱۹ میں پھر لکھتے ہیں:۔۔

" سب کے مولا سب کے آقا پیارے اللہ کے حبیب   فیض و رحمت کے وہ دریا ان جگہ آنیکو ہیں "

" عشق سب کو کیوں نہ ہو محبوب خالق ہیں وہی   آج پردہ غیب سے جلوہ نما آنے کو ہیں "

یہ دو شعر بہ نظر اختصار نقل کئے ہیں ورنہ یہ غزل چھ شعروں کی ہے اور مؤلف کی اس مخصوص صفت سے سراپا موصوف ہے جو آپ کی ایجاد کردہ ہے۔ یعنی نہ صحت لفظی کی مرہون نہ حلیہ معانی کی شرمندۂ احسان۔

قرینہ ہے کہ لائق مؤلف نے یہ صفت اپنے اشعار میں اس مناسبت سے رکھی ہے کہ لفظ شعر اور شیر میں باوجود یکہ تجنیس خطی نہیں ہے۔ مگر کثرت استعمال سے آواز دونوں کی چونکہ یکساں معلوم ہوتی ہے اس لحاظ سے آپ کا ہر شعر بمنزلہ شیر کے ہونا ہے اور عموماً دو شیر ایک جنگل میں باہم نہیں رہتے وہی رعایت ہے کہ آپ کی غزل کے دو شعر بھی ایک دوسرے سے دست و گریبان نہیں بلکہ آپ کے اشعار کا ہر مصرعہ اسی نسبت سے مختلف حیثیت رکھتا ہے۔ کہ شیر کے بچوں میں بھی شیر کے عادات اور خواص ہوتے ہیں۔

یا یہ صنعت اس اعتبار سے ایجاد کی گئی ہو کہ جس طرح مولف نے قافیہ کی شرط کو لازمی

نہیں گردانا۔ اسی طرح بحر کی پابندی بھی اس وجہ سے اٹھادی کہ تھوڑی پابندی بھی دشواری تھی اور اس دردسری کو یوں آسان کردیا کہ جو مصرع جس بحر میں ہاتھ آیا اس کو لکھ لیا اور جب دس بیس مصرع جمع ہوگئے تو اس ذخیرہ کا نام غزل رکھ لیا۔ اور لفظی و معنوی رعایت کے جھگڑوں سے تو جناب کا ہر شعر بالکل پاک و صاف نظر آتا ہے۔

مگر حکیم صفا صاحب کی خدمت میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ غزل کی اس ترتیب کو ممکن ہے کہ طبی محاورہ میں معجون طرفہ بھی کہتے ہوں لیکن ارباب ظرافت کی اصطلاح میں اس طریقہ کو دیوانی ہانڈی کہتے ہیں۔

اور ایک مرصع غزل مؤلف موصوف نے حضور قبلۂ عالم کی تاریخ وصال کی مدحت میں فرمائی ہے چنانچہ صفحہ ۲۷۸ میں آپ لکھتے ہیں۔

نظارہ کرتا رہتا ہوں ہر ایک تاریخ پہلی کا — ثنا خواں میں ہمیشہ رہتا ہوں تاریخ پہلی کا
مرے شاہنشہِ والا کی آمد ہوتی ہے اس دن — کہ جس دن چاند ہوتا ہے مری تاریخ پہلی کا
مرے آقا ہوئے واصل خدا سے چاند جب نکلا — صفر تھا دن جمعہ کا تھا سفر تاریخ پہلی کا
مہاجن ہوں میں آقا کا غلام آزاد ہوں انکا — بنایا مہتمم مجھ کو اسی تاریخ پہلی کا
بنایا ہے مکاں کہتے جسے منزل ہے وارث کا — بچھا فرش مصفا منتظر تاریخ پہلی کا
سبھی یاں اصفیا و اتقیا تشریف لاتے ہیں — ہوں خادم پیشواؤں کا اسی تاریخ پہلی کا
محمد مصطفےٰ اور اہلبیت اصحاب سب ان کے — قدم رنجہ ہیں فرماتے جو دن تاریخ پہلی کا
ثنا خوانی کو عالم اور سب قوال آتے ہیں — ثنا خواں میں بھی ہو جاتا ہوں اس تاریخ پہلی کا
ثنا خوانی کے بعد اطعام کی تقسیم ہوتی ہے — محبت کا یہ ثمرہ ہے اسی تاریخ پہلی کا
ہوا فضلِ خدا مجھ پر مرا ایماں رہا قایم — کہ میری روح میں ہے تذکرہ تاریخ پہلی کا
ہزاروں عید کو قرباں کروں میں اس پہ ہر لحظہ — سما جو دل میں میرے آگیا تاریخ پہلی کا

صفا تو جان و دل کردے فدا تاریخ پہلی پر
کہ تیرے پیر کا ہے وصل اس تاریخ پہلی کا

لائق مؤلف نے یہ مرصع غزل اپنی کتاب کے صفحۂ آخر میں تسطیر فرمائی ہے اس مناسبت سے یہ زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ میں بھی موصوف کے صفات شاعری کی تنقید کو اسی بحث پر معذرت کے ساتھ ختم کر دوں۔

اور اس غزل کے مضامین سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مؤلف ممدوح بقید تاریخ وصال رہنمائے برحق کا ماہانہ نقل پر تکلف طریقہ پر کرتے ہیں۔ خدائے برتر آپ کی اس مستحسن خدمت کو قبول کرے اور جزائے خیر مرحمت فرمائے۔

لیکن اس غزل سے بھی آپ کے ایجاد کردہ صفات شاعری کا کافی اظہار ہوتا ہے۔ کیونکہ اول تو ممدوح کی مایہ ناز صنعت کہ غزل کے ہر شعر کا قافیہ جدید ہو۔ اس ممتاز صفت سے یہ غزل از مطلع تا مقطع سراپا موصوف ہے کہ اس غزل کے بارہ شعر ہیں۔ اور ہر شعر کا قافیہ جداگانہ ہے یہی وہ اجتہاد ہے جس کی نسبت اگر یہ کہا جائے کہ فن شاعری نے نیا جنم لیا ہے تو بجا ہوگا۔

دوسری نمایاں صنعت یہ ہے کہ ردیف ممدوح نے ایسا مکمل انتظام فرمایا ہے کہ پوری غزل کا ہر ایک قافیہ ایسا الگ تھلگ رہتا ہے کہ ردیف سے دست و گریبان ہونا کیسا معمولی طور پر چار آنکھیں بھی نہیں کرتا۔

تیسری قابل قدر صنعت یہ ہے کہ جملہ الفاظ اپنے مفہوم و مقصود کے محافظ اور پردہ دار ایسے ہیں کہ غور و فکر سے بھی مطلب کا انکشاف نہیں ہوتا۔ شاید اسی صنعت کو "المعنی فی بطن الشاعر" کہتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ عالی خیال مؤلف کی فسوں ساز جدت نے صدہا سال کے بوڑھے عروض کی ایسی کایا پلٹ کی اور اس کے محدود احاطہ کو ایسا وسیع میدان بنا دیا کہ جس میں اب شائقین عروض کی بلا تکلف گھوڑ دوڑ ہو سکتی ہے۔

الغرض قبل اس کے کہ جس طرح تھوڑی صراحت سے مؤلف موصوف کے نقل کردہ واقعات مصدقہ کا چہرہ ایسا بے نقاب ہو گیا کہ ہر شخص ان کی حقیقت اور ماہیت کا اندازہ بخوبی کر سکتا ہے۔

اسی طرح ممدوح کے شاعرانہ مذاق اور قابلانہ طرزِ تحریر کی فصاحت اور بلاغت کا بھی اس مختصر تصریح سے اظہار ہو گیا اور اب قارئین اس کا تصفیہ بھی نہایت آسانی سے کر سکتے ہیں کہ جس مؤلف نے غیر واقع واقعات نقل کیے ہوں اور بحیثیت شاعر ایسی پریشان نظمیں مبالغات کے ساتھ درج کی ہوں اس کے استدلال کہاں تک مستند اور قابل سماعت ہو سکتے ہیں

ذکرِ شعرائے وارثی | اسی سلسلہ میں یہ بھی عرض کروں گا کہ علاوہ دیگر خصائص و کیفیات کے غلامانِ بارگاہ وارثی کے چوٹ کھائے ہوئے دل کا عموماً میلان کلام منظوم کی جانب بھی زیادہ ہوتا ہے اور طبیعت کو مذاقِ شاعری سے غیر معمولی طور پر مناسبت ہوتی ہے۔

جس کا سبب بہ لحاظ مشرب یہی ہو سکتا ہے کہ بعض صوفیائے کرام نے علامات محبت کے ذکر میں ایک مخصوص علامت یہ بھی نقل فرمائی ہے کہ اَلشَّوْقُ ثَمَرَۃُ الْمَحَبَّۃِ ؛ یعنی شوق نتیجہ ہے محبت کا۔ اور چونکہ طغیانِ شوق کا اظہار بالاعلان کرنا منافی شانِ محبت ہے۔ اس واسطے محب اپنے اپنے مذاق کے اعتبار سے ایک ایسا پیرایہ اختیار کرتے ہیں جس کے پردہ میں محبوب سے عرضِ حال کر سکیں۔

مگر ماہرینِ فنونِ لطیفہ کی متفقہ رائے ہے کہ جذباتِ شوق کی صحیح تصویر استعارات کے باریک پردوں پر تشبیہات کے نازک اور ہلکے رنگوں میں نمایاں طور پر دکھانا اس مصور کا مخصوص حصہ ہے جس کو عرفِ عام میں شاعر کہتے ہیں۔

اسی لحاظ سے اربابِ شوق حالت اضطراب میں شعرائے متقدمین کے انھیں اشعار کی جن کو عاشقانہ مضامین سے کلیتہً سروکار ہوتا ہے تسکین خاطر کے واسطے مکرر سہ کرر تکرار فرماتے ہیں اور ان کی اس دلچسپ مزاولت کا اکثر نتیجہ آخر یہ ہوتا ہے کہ اثراتِ عشق اور ثمراتِ شوق سے وہ غم رسیدہ موزوں طبع بلکہ بعض واقعہ نگاری میں نامآور شاعر ہو جاتے ہیں۔

اور سرکار عالم پناہ کا یہ فیض عام تو زبان زد خلائق ہے کہ آپ کا کوئی حلقہ بگوش ایسا نہیں جس کے دل میں بقدر استعداد محبت کا جوش نہ ہو۔ اس واسطے اگر یہ کہا جائے

تو ناموزوں نہ ہوگا۔ کہ عنایت وارثی نے اپنے ارادتمندوں کو ان کے حسب حال جو مذاق محبت ودیعت فرمایا ہے۔ اس کے خصوصیات کا یہ بھی ایک غیر معمولی تصرف ہے کہ وہ عقیدت شعار اکثر بالطبع ناظم ہوتے ہیں۔

لیکن اس باطنی توجیہہ کے علاوہ جو نکات اور اشارات پر مشتمل ہے ہمارے اخوان ملت کو سخن سنجی اور سخن دانی سے گہری مناسبت ہونے کا ظاہری اور بہت نمایاں ایک سبب یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح حسب معمول دربار وارثی میں ہر ادنیٰ داعلیٰ کو باریابی ضرور حاصل ہوتی تھی۔ اسی طرح بجز ان مخصوص حضرات کے جن کو مزاج دانی کا شرف حاصل ہوتا تھا عموماً زائرین کو دو چار منٹ سے زیادہ حضوری نصیب نہیں ہوتی تھی۔ اور یہ قلیل وقت مشاہدۂ جمال وارثی میں گزر جاتا تھا۔ عرض حال کرنے سے وہ قاصر رہتے تھے۔ اور ان کی یہ محویت بے وجہ بھی نہیں تھی۔ کیونکہ الفت جو اس راہ میں بہت چھوٹا درجہ اور مراتب محبت کے ایوان بلند کا پہلا زینہ ہے اس کی تعریف ارباب طریقت نے یہ فرمائی ہے کہ "دھی مَیلاَنُ الْقَلبِ اِلَی المَالُوفِ" یعنی الفت کی علامت یہ ہے کہ قلب کو مالوف ہی سے سروکار رہے۔

اور قطع نظر اس کے اگر اتفاق سے حاضرین کو اظہار حال کا موقع کبھی مل بھی جاتا تھا اور بزم وارثی کو اغیار سے خالی بھی دیکھتے تھے تو وہ حق نیوش اکثر بجہت آداب طریقت خاموش رہتے تھے۔ کیونکہ جذبات قلبی کے واسطے ضبط و تحمل لازمات سے ہے۔ چنانچہ عارف حق خواجہ شبلی علیہ الرحمۃ کا قول ہے کہ "اَلْمَحَبَّۃُ کِتْمَانُ الْاَحْوَالِ" یعنی محبت کی تعریف یہ ہے کہ احوال پوشیدہ رکھے۔

غرض اس کشمکش میں کہ دل کی یہ خواہش کہ عرض حال کرو اور اقتضائے مشرب یہ کہ ساکت رہو۔ پرستاران صادق نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اپنے جذبات کو نظم کے پردے میں اظہار کرنے لگے جس کی ابتدا از نوقصیدہ) یا بصورت مثنوی ہوتی تھی مگر آگے در پردہ طلب محبت یا کسی فرضی پیرایہ میں اپنے واردات و کیفیات کا مجملاً تذکرہ یا بکمتیلا عنایت و پرورش کی استدعا یا اسکو مختصر کرنے

مختصر یہ کہ وہ نظم صورتاً تو مضمون آرائی کا طومار ہوتی تھی ۔ مگر بالمعنی اسے مشرح عرضداشت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا اور خوش قسمتی سے وہ ارادتمند اپنی اس کوشش میں اس لئے امید سے زیادہ کامیاب بھی ہوئے کہ خود حضور قبلۂ عالم کو کلام منظوم پسند بھی تھا اس واسطے جناب حضرت اس کو برغبت سماعت فرماتے تھے اور اسی طرح نکات شاعرانہ اور محاورات کی بندش کی داد دیتے تھے کہ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ آپ بہت بڑے نقاد سخن اور فن شاعری میں ید طولےٰ رکھتے ہیں ۔

الغرض یہ طریقہ جو "یک کرشمہ دو کار" کا مصداق تھا ۔ مشتاقین جمالِ وارثی کو اس قدر مفید معلوم ہوا کہ اکثر برادرانِ طریقت نے مدحت سرائی شروع کر دی اور تھوڑے عرصہ میں یہ کیفیت ہوگئی کہ دس بیس نظمیں روزانہ پیش ہونے لگیں اور حضور قبلہ عالم کی یہ شان بندہ نوازی بھی مستقل ہوگئی کہ عربی فارسی اردو ہندی کے قصائد اور غزلیات بکمال دلچسپی آپ سننے اور مسرور ہوتے ۔

رفتہ رفتہ یہ طرز استدعا ایسا ترقی پذیر ہوا کہ آستانہ اقدس پر دو چار ناظم ہر وقت نظر آنے لگے ۔ چنانچہ میری حاضری کی قلیل مدت میں جس قدر مداح وارثی گزرے ہیں اگر ان کا ذکر معمولی صراحت کے ساتھ نگارش کروں تو وہ فہرست بجائے خود ایک ضخیم رسالہ ہو جائے ۔ لہٰذا بنظر اختصار چند حضرات کے نام اور ان کے بعض اشعار تمثیلاً لکھتا ہوں ۔ جن کے مطالعہ سے ناظرین کو ان کے جوش قلبی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے ۔

چنانچہ پہلے منشی خدابخش صاحب وارثی متخلص بہ شائق دریاآبادی کا ذکر اس لحاظ سے کرتا ہوں کہ موصوف سرکار عالم پناہ کے قدیم مداح اور نہایت پر جوش حلقہ بگوش تھے ۔ اور آپ ہی کی بلیغ کوشش کا یہ زرین کارنامہ ہے کہ حضور قبلۂ عالم کے ابتدائی حالات دواقعات ضبط تحریر میں آئے اور تحفۃ الاصفیاء کے نام سے وہ رسالہ شائع ہوا اور اسی مجموعہ سے جملہ مؤلفین سیرت وارثی نے ایام رضاعت اور ملک حجاز کی مسلسل سیاحت کے مضامین اخذ کئے ہیں ۔ اور آپ کی اسی ارادت صادق کا اظہار آپ کے کلام منظوم سے ہوتا ہے کہ استعارات

کی نزاکت اور تشبیہات کی بندش کے ساتھ کوئی شعر فلسفۂ تصوف سے خالی نہیں۔ چنانچہ آپ نے ایک غزل خواجہ حافظ کی غزل پر لکھی ہے جس کے دو شعر یہ ہیں۔

ز فرطِ بدگمانیہا کجی دارم بہ دل پنہاں — نمی خواہم کہ بیند آئینہ آں روئے زیبارا
گرفت اطراف عالم را محیط امروزائے شائق — مگر سیل سرشک تو بجوش آورد دریارا

اور یہ شعر بھی آپ کی ایک غزل کا ہے۔

زاہد بہ زلف وخال وخطت کردتا نظر — کردست جیب و دامن ودستار زنار

اور ایک غزل کے تین شعر یہ ہیں۔

کردمسعود دراہ حور و ملک — دو دآہم سر سما دارد
داد دلدار دردا گر مارا — او ہمہ درد را دوا دارد
اوکہ صدہا مرا ہم آوردہ — گر ہلاک آورد روا دارد

بلکہ فارسی میں ایک مثنوی بھی آپ نے لکھی ہے جس کی تمہید میں ایک فرضی زاہد کی محبت کا دلگداز قصہ ہے اور اسی پردہ میں اپنی حالت کا اظہار ایسے خوش عنوان طریقہ سے کیا ہے کہ بقول مولانا۔

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں — گفتہ آید در حدیث دیگراں

علیٰ ہذا مولانا عقل وارثی لکھنوی کا مختصر واقعہ یہ ہے کہ آپ مذہبًا اثنا عشری اور نسبًا سید اور خاندان اجتہاد سے تھے مگر حضور قبلۂ عالم کا روئے حق نما دیکھکر زبان صدق سے اُولٰئِکَ ھُمُ الْوَارِثُوْنَ کہا اور ظلِ حمایت وارثی میں پناہ گزین ہوئے اور تاحیات مدحت سرائی کی۔ چنانچہ آپ کی تصنیفات میں سے تہتر شعر کا ایک قصیدہ جو قصیدہ اتحادیہ کے نام سے مشہور ہے اس کے بعض شعر یہ ہیں۔

عشاق محو او بیند۔ ہر جا ش جملہ جو بیند — درکوئی او بپو یند گم کردہ دست و پارا
ایں اہل باطنا تند ایں لب کائناتند — ناموس دا امنانند اسرار انبیا را

چو آں کمیلِ کامل - با معرفت مواصل | از سالکان واصل بشہود مصطفےٰ را
ہمنام سبطِ اکبر - مشتق ز حسن مصدر | حسنِ حسن میسّر - آں خیر اصفیا را
سلمانِ فارسی بود - آں نقشبند معنی | بر لوحِ صاف باطن - مرضی مرتضیٰ را
یک بود آں اویس قرنی - دانائے رمز ایمنی | خیر القرون قرنی - سلطان انبیا را
مقدا اوند ہم ابوذر - داں راز داں حذیفہ | بودند اہلِ باطن - تارک زر و طلا را
ہم با بزید و کرخی و سری - جنید و شبلی | ایں جملہ عارفانند - اسرار اوصیا را
کایں غوث و قطب و ابدال - آیات کبریائیند | ہم مظہر خدایند - انسراد ماسوئی را
نخل آلہ ادحد - قائم مقام احمد | مہدی دیں محمد - سلطان اولیا را

اس بسیط تمہید کے بعد مدحتِ ممدوح کی جانب آپ نے گریز فرمائی اور لکھتے ہیں۔

الحال قطب دوراں غوث زمان حاضر | وارث علی چو نوح ست - کشتی اتقیا را
الیاس بحر عرفاں - ادریس خلد رضواں | ساقی آب حیواں - اسکندر و گدا را
لقمان حکمت ست او - داؤد شوکت ست او | فرمود چوں سلیماں تسخیر ایں سبا را
از لہب آتش عشق - تا سوخت ہر رگ و پے | مثلِ خلیل دریافت - او باغ مدعا را
بہر کلیم سینا - خلوت گہ وصال ست | او سینہ کرد سینا - معراج اتقیا را
یوسف بصورت ست او - یعقوب سیرت ست او | تا کرد نام روشن - یحییٰ و زکریا را
عیسیٰ صفت زہد ست - او پیر را دلیہد | عشق حق لبر کرد شیب و شب صبا را
آخر ز بیت ظاہر - معنے نبی آحتر | ایں خبر وارثاں شد آئینہ اولیا را
نے نے غلط نوشتم - آئینہ چیست ہیچیں | انساں عین او ہست - اخیان انبیا را
یکتا و بے نظیر است - فرد است دہر سرت | ارشاد لا تسبّوا - ہندست از کیا را
فرد ست در قناعت - یکتاست در مناعت | شیر ست در شجاعت ہر بیشہ وغا را
مثلِ جنید دارد - بخنید لشکر صبر | داد شکست فاشے - حرص و طمع ہوا را

اسرار او چو سترے اشغال او چو شبلی | اطوار او چو نوری۔ روزانہ و شبانہ را
بسطامی زمانہ۔ معروف رابگانہ | ذکرش بود نشانہ۔ اسعاف مدعا را
آں اکرم النفوس ست آں اعظم الرؤس ست | آں مطلع الشموس ست۔ والشمس والضحیٰ را
وارث۔ ولی مرادف۔ معنی ارث دارند | چوں احمدؐ و علیؓ راہست اتحاد آرا
لفظ عَلِیٌّ مِنِّیْ ہم با اَنَا مِنْہُ | باشد حدیث صادق۔ سردار انبیاء را
ہم رُوْحُکَ رُوْحِیْ ہم نَفْسُکَ نَفْسِیْ | ہم جِسْمُکَ جِسْمِیْ ہم لحمہ و ہم دما را
ہر گونہ اتحادے قلبی و معنوی است | ہم لفظی ہست حرفے تا کے کنم ثنا را
گر قلب داد خواہند۔ پس وادِرا بخواہند | ارباب علم دانند۔ ایں رمز آشکارا

اسی طرح سرکار عالم پناہ کے قدیم خرقہ پوش فقیر رحیم شاہ صاحب نے۔ جو عرصہ تک خادم خاص کے ممتاز عہدہ پر مامور رہے قبلۂ عالم کی مدحت سرائی کے پردہ میں ہمیشہ اپنے جذبات قلبی کا اظہار زبان بھاکا میں کیا۔ حتّٰی کہ حضور کی اجازت سے۔ اپنا تخلص بھی نادم رکھا۔ اور آپ کی تصانیف کا مجموعہ ۱۳۱۵ھ ہجری میں چھپ بھی گیا۔ جو "یادگار نادم" کے نام سے مشہور ہے اور اس کی ابتداء اس بھجن سے ہے۔

پر بھو ہم دیکھی نھاری پر بھوتائی

جل کے اوپر تھم بھپایو پرتھی دیہو بسای | بنا ٹیک لے گگن پھرایو یک چھن تھہر نہ ہائی
پانی۔ پون۔ اگن اور کھیا۔ دینھو ایک ملائی | چار یو کا لے پنڈ بنا یو۔ تہہ بیچ گیو سمائی
جوگی بن کے جوگ کیو ہے تپسی بن تپ لائی | سنتن کے نت سنگ رہت ہو انت کوؤ نہیں پائی
گھٹ ہے جب پرگھٹ ہوئے وارث دینھو درس دکھائی | نرکھت موہ گیو من نادم نینن صورت سمائی

پھر ایک ٹھمری میں آپ لکھتے ہیں

لاگے مین کا وارث چھب پیاری | بھولی بھالی صورت پر واری
گورے گورے بدن پر تہبند سوہے | جھم جھم چال چلت متواری

سُندر روپ سلونے بنا — جھہ چتوت تہہ مارت کٹاری
کتنو دہائے گرت چرنن پر — کتنو آئے کے کرت جوہاری
نا دم جیا ترسے بن درشن — کب درشن دیہیں موہن مراری

ایک ٹھمری کے دو شعر یہ ہیں

وارث موری نیا کے تمہیں رکھوار

اگم اتھاہ بیہم کی ندیا جور بہت ہے دھار — تہہ بیچ آئے پڑے بن کھیوٹ کوئی نہ سہارن ہار
لکھ لکھ لہر آپار سمندر کی ڈر لاگے ادھکار — جیا لرجے تن تھر تھر کانپے من نہیں پکڑے کرار

اور حکیم سید عبد الآد شاہ صاحب خرقہ پوش بارگاہِ وارثی۔ متخلص بہ تحیر متوطن مضافات گیا جو بہت عالی خیال اور صاحب تصانیف تھے۔ اور ہمیشہ اپنے حالات و واردات کا ذکر منظوم عرضداشت میں کرتے تھے۔ چنانچہ آپ کی ایک مرصع نظم کے چند اشعار یہ ہیں

بر در آمد بندۂ فرمان تو — خانمانِ او ہمہ قربانِ تو
اللہ اللہ باکہ گویم حال زار — نیست اکنوں جادۂ صبر و قرار
اللہ اللہ از کہ باشم چارہ جو — خاک بر سر میدوم ہر چار سو
اللہ اللہ ایں چہ رخنہ برفتاد — ہر کسے از خویش ماندہ زامراد
اللہ اللہ ایں چہ عالم کردۂ — نیز بے پردہ شدی در پردۂ
رحم کن اکنوں خدارا دلبرا — از قیود شرک مخفی کن رہا
رحم کن بر حالت اندوہ گیں — انت ربی انت خیر الوارثین

اور آپ کی ایک غزل کے دو شعر یہ ہیں۔

مومت شراب عشق ذاتم — بیروں ز حدود ایں صفاتم
تا لذت درد با چشیدم — سیراب ز چشمۂ حیاتم

ایک غزل میں آپ فرماتے ہیں۔

ہر زماں خشکی دگر پیدا کنی — جان عالم بیشتر شیدا کنی
لن ترانی گہہ بگوئی از عنبر در — گہہ تجلی بر سر سینا کنی
از تحیر نوش جام وارثی — تا کجا فکر رہ انشا کنی

ایک غزل کے دو شعر یہ ہیں۔

چند جوئی داروئے درد جگر اے چارہ ساز — داروئے ما عشق باشد عشق ما درمان ما
ماندانم جز حدیث عشق دیگر آیتے — جان ما عشقم بود عشقم بود جانان ما

معہذا مولوی لطافت حسین صاحب وارثی متوطن شیخپورہ ضلع مونگیر۔ جو عربی کے مستند ادیب اور معقولات کے مکمل عالم تھے۔ ان کا عجیب واقعہ ہے کہ ربیع الاول ۱۳۰۸ ہجری میں حضور قبلۂ عالم کا نام نامی سُن کر نادیدہ مشتاق زیارت ہوئے۔ اور اس گرویدگی کا یہ اثر ہوا کہ دفعتہ عادات روزمرہ کے ساتھ خیالات میں بھی عظیم انقلابات رونما ہونے لگے۔ چنانچہ پیش ازیں ان کی طبیعت کو شاعری سے کوئی خاص مناسبت نہ تھی۔ مگر اس شیفتگی کے انتظار میں چوبیس اشعار کا ایک قصیدہ لکھا۔ جس میں شوق قدمبوسی کے سلسلہ میں اپنے جوش ارادت کا بھی اظہار کیا جس کے چند شعر یہ ہیں۔

اے قبلۂ ایمان من گاہے نظر بر من فگن — اے کعبۂ ایقان من گاہے نظر بر من فگن
اے پاسخ ارمان من اے حجت برہان من — اے معنی قرآن من گاہے نظر بر من فگن
تصدیق تو ایمان بود منکر ز تو شیطان بود — اسلام من ایمان من گاہے نظر بر من فگن
نے مومنم نے کافرم از ہر دو فارغ خاطرم — بر تو بود اذعان من گاہے نظر بر من فگن
جامے بدہ ستم کند تانیست از ہستم کند — اے ساقیٔ دوران من گاہے نظر بر من فگن
نادیدہ دیدار شما۔ چوں اویسم باشم مبتلا — تو اے محمد زان من گاہے نظر بر من فگن

غرض کچھ روز تک یہی قصیدہ شب و روز کا وظیفہ رہا۔ لیکن مجیب الدعوات نے ان صدق و خلوص کا یہ ثمرہ مرحمت فرمایا کہ شروع شعبان میں داخل سلسلہ ہو کر ظل حمایت

دارثی میں پناہ گزین ہوگئے اور دوسرا قصیدہ جو پیش کیا اس کے بعض اشعار یہ ہیں۔

ضرب مردانہ زن سینۂ صد چاک شوم — دل چو بشکستہ شود عرش شہ پاک شوم

سر بکف حلۂ خونیں کفناں زیب بدن — با امید یکہ شہید یت سفاک شوم

خوش خرامم چو برہنہ کفنیا می آید — جاں بگوید کہ براہش خس و خاشاک شوم

خاک بہ عیش و نشاطیکہ بداریں دہنہ — درد عشق تو بدل گیرم غمناک شوم

شہسوارم چو کند عزم شکارِ دلِ من — نیستم جاں صید گہ ہدیۂ فتراک شوم

نقدہا سوختہ ام نفسِ عدو لیک نسوخت — آتشے زن کہ زخاکسادہ ام خاک شوم

مداح کے معنوی مرادات اور خواہشات کو ممدوح نے کہاں تک پورا کیا۔ اس کی تو خبر نہیں۔ مگر بظاہر یہ ضرور دیکھا کہ حضور قبلۂ عالم نے مخاطب ہوکر اس منظوم عرضداشت کی سماعت فرمائی۔ اور مسرور ہوئے۔ بہرکیف کسی وجہ سے کیوں نہ ہو۔ لیکن مصنف موصوف کا یہ دستور پڑ گیا کہ جب حاضر خدمت ہوئے قصیدہ نذرِ پیش کیا۔ چنانچہ اسی دوران میں ایک نظم جو سراپا جذبات محبت سے معمور۔ اور حضرت امیر خسرو کی طرح پر لکھی گئی پیش کی جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

من قبلہ راست کردم بر سمت خوش لقائے — عریاں سرے چو ماہے شوخے برہنہ پائے

از چشم و ابرو انش غارت گر جہانے — صد فتنہ در نگاہے صد عشوہ در ادائے

مخمورے پرسنے ظالم دراز دستے — رفتار ہیچو مستے ہشیار دل ربائے

مہتاب بے حجابے خورشید بے نقابے — عیارہ بیوفائے فتاں کج ادائے

در دیدہ گن نگاہے از دل کشم من آہے — باشم قتیل چشم دیک غمزہ خوں بہائے

از انجملہ موصوف نے ایک اور قصیدہ لکھا۔ جس کا مطلع یہ ہے

اے قصر تو بلند زپرواز فکرِ من — میدان فراخ تنر زنگ توسن سخن

اس معرکۃ الآرا قصیدے کی تمہید پچاس اشعار میں ایسے خوش عنوان اور دل گداز

پیرایہ میں لکھی ہے جس نے نفس مضامین کو اور زیادہ پُر اثر کر دیا۔ چنانچہ اس قصیدہ کے مطلع ثانی کے ساتھ چند اشعار تمثیلاً نقل کرتا ہوں جن سے مصنف کے واردات و کیفیات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

مطرب بیا بہ پردۂ دیگر سرود زن — ساقی بدہ بساغر نو بادۂ کہن

آب حیات دہ بمن مردۂ قدیم — مے جان دہد بمردۂ صد سالہ در کفن

جامے بدہ کہ دیدۂ جان را بصر دہد — گفتند روئے حق نتواں دید چشم من

در ہجر تار نا بکجا رنج و غم کشم — مے دہ کہ بگذرم ز خودی و ز خویشتن

شوخے ہر آں گشتہ بصد شان جلوہ گر — روز ازل گر قسمت سبقہائے مکر و فن

کافر بتے کہ دین مسلماں برد بزور — ترکے کہ کرد غارت زنار برہمن

تارے بصد بہانہ کند صید عاشقاں — گاہے ز تیر غمزہ گہ از زلف پُر شکن

پھر قریب اختتام ممدوح سے استدعا کرتے ہیں۔

دردیکہ جملہ علت ما را دوا بود — دردیکہ بعد مرگ بود حرز جان و تن

دردے کز وز دار سفر جان مبتلا — رقصاں رود بشوق سوئے اولیں وطن

دردیکہ بعد مرگ برد در دیار تو — بے غسل لاشۂ من و بے گور بے کفن

ناکردہ کس نماز برد۔ نے دعاء خیر — باشد غذائے زاغ دیار تو و زغن

گفتم ہر آنچہ گفت دل پر ہوس مگر — ترسم کہ در نواح تو پیچید آنکہ عفن

بلکہ ایک قصیدے کی تمہید میں مولد وارثی (دیوی شریف) کی مدحت۔ شاعرانہ پیرایہ میں اس خوبی سے کی ہے کہ آداب ارادت کے ساتھ۔ نازک استعارات ہیں۔ اپنے تخیلات کا اظہار بھی کر دیا اور عاشقانہ مذاق کی بلند خیالی بھی قائم رہی۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں۔

مطلع خورشید ایمان ست زاں سیمائے من — نور پیشانی است خاک کوچۂ دیوائے من

ہیچ می دانی چہ دیوا۔ مظہر رحمانی است — مرسخائے عالمین و مامن و ملجائے من

خود چہ دیوائے نماز گاہ شوقِ عاشقاں　　موطنِ محبوب یزداں منزلِ سلمائے من

خود چہ دیوا عاشقاں را کعبۂ ایمان و دین　　مقصدِ صحرا نورداں محل لیلائے من

من غلام حضرت وارث شدم دیوا پرست　　بود در طفلی ہمیں بازیگہ آقائے من

الحاصل فیضان وارثی کا یہ بھی ایک یادگار کرشمہ ہے کہ مولوی لطافت حسین صاحب جو درحقیقت اپنی فردتنی کے لحاظ سے فن شاعری کو صرف نمود و شہرت کا ذریعہ سمجھتے تھے مگر جوش محبت نے ان کی اس متانت کو اضطراری حالت سے ایسا مبدل کر دیا کہ اسی سادہ مزاج مولوی کی طبع موزوں نے تقریباً چالیس قصائد میں برجستہ وہ مضامین لکھے جو کہنہ مشق اور عالی خیال شعرا کے کلام سے کسی طرح کم نہیں۔ اور تعجب یہ ہے کہ طبیعت کی نظرتی افتاد کہ شاعری سے عدم رغبت۔ وہ بھی قائم رہی۔ کہ تخلص جو اس فن کا خاص تمغہ ہے۔ اس کو آپ نے قطعاً ناپسند کیا۔ بلکہ مذکورہ بالا قصیدہ کے ایک شعر میں اپنے اس خیال کو صاف لفظوں میں لکھ دیا کہ

شاعراں را خلعت دمار است عُریانی ہوس　　اے جنوں ایں جامہ را کن چست بربالائے من

یہی صورت شیخ امین الدین صاحب وارثی سیتے پوری نے اختیار کی تھی۔ جو قبلۂ عالم کے قدیم حلقہ بگوش اور نہایت پرجوش ارادتمند تھے کہ جب حاضر خدمت ہوتے زبان بھاکا میں اپنا نو تصنیف بھجن یا کبت یا کوئی چوپائی ضرور پیش کرتے۔ اور اگر حکم ہوتا تو نہایت پردرد لہجہ میں سناتے جس کا مضمون عموماً پیشوائے برحق کی مدحت۔ اور آخر میں محبت کی استدعا ہوتی تھی۔

چونکہ موصوف کو اودھ کی قدیم زبان کے محاورات اور شعرائے ہند کے استعارات سے کماحقہٗ واقفیت تھی۔ اور طبیعت بھی فطرۃً موزوں اور رنگین پائی تھی۔ اس لحاظ سے آپ کا کلام منظوم شاعرانہ تشبیہات سے مملو۔ اور عاشقانہ تخیلات سے معمور ہوتا تھا۔ چنانچہ آپ نے سلسلۂ وارثیہ کے شجرۂ قادریہ رزاقیہ و چشتیہ نظامیہ بھی بد مادت کے طرز پر بکمال وضاحت نظم کئے تھے۔ مگر افسوس اس کا کوئی نسخہ اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔ ورنہ

تمثیلاً ضرور نقل کرتا۔

اور موصوف کے ہم عصر۔ دوسرے شاعر۔ ماہر زبان بھاکا شیخ حسین علی صاحب وارثی۔ متخلص بہ نواب۔ متوطن وزمیندار سادہ مو ضلع بارہ بنکی بھی اپنے زمانہ کے مستند اور پرگو کبیشر تھے۔ جن کا بارگاہ وارثی میں قدیم اور مخصوص ارادتمندوں میں شمار ہے۔ ان کا بھی یہی طریقہ تھا کہ جب بہ اشتیاق زیارت حاضر خدمت ہوتے تھے۔ تو آپ کا یہ دستور تھا کہ اگر دن میں چار مرتبہ قدمبوس ہوتے تو ہر مرتبہ اپنی تازہ تصنیف ضرور سناتے تھے۔

اور چونکہ مضمون حسب حال ہوتا تھا۔ اس لئے آپ کا کلام پر اثر زیادہ ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ کا تو تصنیف کبت جو آپ نے برجستہ لکھا تھا سُن کے حضور قبلۂ عالم نے فرمایا کہ "حسین علی تم اپنے وقت کے کبگنگ ہو"

بلکہ زبان بھاکا میں آپ ایسے قادر الکلام شاعر تھے کہ حسب ایمائے سرکار عالم پناہ آپ نے پورا واقعہ کربلا نظم کیا تھا جو تاریخی واقعات اور مستند روایات کی حیثیت سے اپنی شان میں یگانہ مرثیہ۔ اور کتاب سر الشہادتین کا صحیح ترجمہ تھا۔

غرض اخوان ملت کو فن شاعری سے غیر معمولی مناسبت ہونے کا سبب بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ عرض حال کے واسطے یہ بہترین طریقہ اختیار کیا تھا۔ چنانچہ حاجی اوگھٹ شاہ صاحب وارثی۔ بچھرایونی۔ جو حضور قبلۂ عالم کے قدیم خرقہ پوش فقیر ہیں۔ ان کا بھی نصب العین یہی دیکھا کہ اپنے قیام کے زمانہ میں۔ اکثر تنہائی کے وقت صوفیائے کرام کے چیدہ چیدہ وہ اشعار۔ جن کے مضامین اپنے حسب حال ہوتے تھے۔ پُرسوز لہجہ میں سرکار عالم پناہ کو سناتے تھے۔ اور جب یہ عمل مفید ثابت ہوا۔ اور شوق کی تحریک ہوئی۔ تو رفتہ رفتہ طبیعت موزوں ہوگئی۔ اور اپنے تخیلات کا نظم کے پردہ میں اظہار کرنے لگے۔ چنانچہ آپ کی ایک غزل کا مطلع اور حسن مطلع یہ ہے۔

الٰہی جب دم لبوں پہ دم ہو۔ زباں ہو صرف شنائے وارث | کہ دل میں شوق وصال وارث ہو۔ آنکھ محوِ لقائے وارث

جہاں میں اپنی نظر سے گذرے ہزاروں خوش رو معشوق لاکھوں مگر نہ دیکھی یہ شان و خوبی۔ جدا ہے سب سے ادائے وارث

ایک ہندی زبان میں غزل لکھی ہے جس کے دو شعر یہ ہیں۔

دیوی باتی۔ کنور کنہیا۔ موہن پیارے۔ بنسی دھاری جنم کے راجہ۔ سندر چھیلا۔ مور گوسائیں۔ شام بہاری

بانکی سج دھج۔ ٹھاٹھ انوکھے چال بھی چنچل پیاری تیاں سانولی صورت نین رسیلے۔ ترچھی چتون۔ چھل بل نیاری

آپ کی تصنیفات میں مجموعۂ تسلیم پنجگانہ کی تسلیم چہارم کے چند اشعار جن میں جذبات قلبی کا اظہار کیا ہے یہ ہیں۔

سلام اللہ۔ مولائے۔ کہ روئے حق نما داری سراپا حسن محبوبی و شان مصطفےٰ داری

سلام اللہ اے نور حقیقت زینت عالم دریں کثرت پئے حیلہ گرفتی صورت آدم

بگویم آشکارا مظہر ذات نہاں ہستی مگر چوں صورتے داری نشان بے نشاں ہستی

سلام اللہ۔ اے خضر جہاں چوں رہبری کردی دو بالا در زبان خویش نام حیدری کردی

نہ باغ خلد میخواہم۔ نہ حوران جناں خواہم مگر نظارہ روئے ترا اے جان جاں خواہم

گدائے کوئے تو اوگھٹ۔ لباس بے نوا دارد ہمیں در دل تمنائے ہمیں بر لب صدا دارد

نہ دارم ذوق رندی۔ نے خیال پاک دامانی مرا دیوانۂ خود کن۔ بہ ہر رنگے کہ میدانی

اور زبان بھاکا میں جو دوہے لکھے ہیں۔ ان میں سے چند دوہے یہ ہیں

اوگھٹ چیلا وہی گنی۔ جو بن گرو تجے نہ سانس سوتے جگتے دھیان رہے۔ گرو کو راکھے پاس

اوگھٹ گہت میں پیران ہے اور پیران بیچ الکھ جو پکڑے اس چور کو۔ وہ جوگی بہر جور

مدھوا پیو پریم کا۔ بن میں کر استھان من موہن کے دھیان میں۔ اوگھٹ تجو پران

بانھ گھی مجھ پاپن کی۔ تب ایک بچن سُن لیو نس دن بتیا پڑے گوسائیں۔ اپنا درشن دیو

اوگھٹ چیلا وہی گنی۔ جو اپنی سدھ بسرائے گیان رہے اور دھیان رکھے اور سانس نہ خالی جائے

اسی طرح بیدم شاہ صاحب وارثی۔ متوطن اٹاوہ۔ جو حضور قبلۂ عالم کے تہبند پوش حلقہ بگوش تھے۔ اور جن کا نام اس قدر مشہور ہے۔ جو تعارف و تعریف کا محتاج نہیں۔ اور ان کا

بھی علم سب کو ہے کہ موصوف کو فن شاعری سے گہری مناسبت تھی۔ اور تقریباً چالیس سال کے اس انہماک کا نتیجہ آخر یہ ہوا کہ شعرائے حال کی فہرست میں آپ کا نام جلی قلم سے لکھا گیا۔ اور مخصوص شعرا کی صف میں آپ کو جگہ ملی۔

اور جس طرح آپ کا کلام پسندیدۂ خاص و عام تھا۔ اسی طرح آپ قادر الکلام بھی ایسے تھے کہ بجائے ایک دیوان کے عموماً جو شاعر کی تمام عمر کا سرمایہ ہوتا ہے۔ آپ کے چند دیوان چھپے۔ اور موصوف کو صاحب دواین کا مرتبہ حاصل ہوا۔ کیونکہ احباب کے اصرار سے ہر دوسرے تیسرے سال آپ کا نو تصنیف کلام شائع ہوتا رہا۔ بلکہ اس کثرت سے دیکھ کر۔ آپ کے منتخب کلام کو تمثیلاً نگارش کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

لیکن یہ سوال پیدا ہو کہ موصوف کا کلام اس قدر مقبول اور ہر دل عزیز کیوں ہے تو بظاہر اس کا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ سرکار عالم پناہ کا یہ مخصوص تصرف کہ جملہ اہلِ ارادت کو بقدر حیثیت۔ درد محبت ضرور مرحمت ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے موصوف کا قلب بھی اس فیض وارثی سے یقینی مستفیض ہو گا۔ تو اس کا تعجب نہیں ہے۔ کہ آپ کے پر درد دل کی جگر سوز آواز دوسروں کے دل کو متاثر کرتی تھی۔ اور "ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد" کا مضمون تھا۔

علاوہ اس خوبی کے۔ آپ کے کلام منظوم کو نظر تامل سے دیکھتے ہیں۔ تو یہ بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس شاعری سے آپ کا اصل مقصود وہی تھا کہ اس پیرایہ میں۔ رہنمائے کامل سے استدعائے عنایت کرتے تھے۔ چنانچہ آپ کی کوئی غزل ایسی نہیں پاتے جس میں مجیب الدعوات سے مراد روحانی کے واسطے طلب امداد نہ ہو۔ یا مبدا فیض کے کسی گرانقدر احسان کا بمقولہ "اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ" شکر نہ ادا کیا ہو۔

بظاہر یہی مذاق شاہ شاکر صاحب حامل خرقۂ وارثی کا نظر آتا ہے کہ باوجود دیکہ ایسے ممتاز عہدہ پر مامور ہیں کہ بہ لحاظ شرف قدامت آج بھی منجانب ٹرسٹ کمیٹی آپ

کا آستانۂ اقدس کے مخصوص خدام میں شمار ہے اور ہمہ وقت کی حاضر باشی کا ایسا شرف ہے، کہ بے حجاب عرض حال کر سکتے ہیں۔ لیکن محبت کا وہ خاصہ جس سے عموماً محب متاثر ہوتے ہیں کہ طبیعت کلام منظوم سے مانوس ہو جاتی ہے وہ کلیتہً موجود ہے۔

حالانکہ افتادِ مزاج یہ ہے کہ آپ شعر و شاعری کا تذکرہ کبھی نہیں کرتے۔ مگر خاموشی کے ساتھ ہمیشہ جذبات قلبی کا اظہار اپنے بندہ نواز دستگیر سے نظم کے پیرایہ میں کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے کہنا پڑتا ہے کہ غلامان بارگاہ وارثی کی طبیعت کم یا زیادہ موزوں ضرور ہوتی ہے۔

علیٰ ہذا حضور قبلۂ عالم کے عہد ظاہری کا دور آخر تھا کہ مولوی سید غنی حیدر صاحب وارثی وکیل و رئیس گیا شرف بیعت سے مشرف ہوئے۔ اور فیضان وارثی نے آپ کو ایسا گہرا تعلق مرحمت فرمایا کہ موصوف نے اپنی بافروغ وکالت سے دست بردار ہو کر دیوی شریف میں زیادہ قیام کرنا اختیار کیا۔ اور آستانۂ اقدس کے ایسے گرانقدر خدمات کئے جن سے آپ کے صدق و خلوص کا کافی اظہار ہوتا ہے۔

مگر تعجب یہ ہے کہ آپ کے خیالات پر گو شریعت کا اثر اعتدال سے زیادہ غالب تھا۔ جس کے سبب سے اگر ادائے فرائض اور تلاوتِ قرآن اور کثرتِ وظائف سے فرصت کبھی ہوتی تھی تو کتب بینی کرتے تھے۔ لیکن مذاق شاعری سے آپ کو قطعاً مناسبت نہ تھی۔

لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد۔ مخصوص تصرف وارثی۔ یعنی محبت کی اس لازمی علامت کا بھی اظہار ہوا کہ آپ کی طبیعت موزوں اور پُر جوش ہو گئی۔ اور آپ نظم کے پیرایہ میں اپنے حالات اور کیفیات عرض کرنے لگے۔ اور یہ طریقہ ایسا مفید معلوم ہوا کہ قریب قریب ہر مہینے میں ایک منظوم عرضداشت پیش کرتے تھے۔ چنانچہ آپ کی نظموں کا بڑا مجموعہ "عرائض منظومہ" کے نام سے چھپ گیا۔ لیکن بہ نظر اختصار میں آپ کے ایک مطول قصیدے کے چند اشعار تمثیلاً نقل کرتا ہوں۔ جن کے مضامین سے مصنف کے خیالات کا اندازہ بہ آسانی ہو سکتا ہے وھو ہذا۔

ای سر بسر جہاں۔ وے وارث کون و مکاں ہستی عیاں در ہر نشاں۔ گشتی نگر از من نہاں

از خویشتن بگریختہ ۔ خود را بتو آویختہ   با درد و غمم آمیختہ ۔ فارغ شدم از این و آں

تا کے بمانم در قفس ۔ در بندِ صد حرص و ہوس   خواہم کہ باشم ہر نفس ۔ در ذکر تو رطب اللسان

ذکرت چہ باشد ۔ زندگی ۔ فکرت چہ باشد بندگی   سکرت بود آزادگی ۔ از بند افکار جہاں

صد صد ہزاراں قدسیاں ۔ گویند در وصفت چناں   عالی نسب حاجی لقب ۔ وارث علی شاہ زماں

یک کنزِ مخفی بودی ۔ پنہاں بخود ۔ از نور خود   آخر بشوق دید خود ۔ با نور خود گشتی عیاں

بہر محبت عاشقی ۔ از نفخ اُنسِ وارثی   جا کرد بہر رہبری ۔ اندر مشام روح و جاں

در سیر آفاق جہاں ۔ گشتی بہر سو رہبراں   ہم بہر حج عاشقاں ۔ بگزاشتی ہندوستاں

آں حلۂ باغ ارم ۔ یعنی کہ احرام حرم   عشاق را خوش پیرہن ۔ دائم گرفتی شادماں

آخر عنانِ عزم را ۔ برتافتی سوئے وطن   فرقت کشاں را عید شد ۔ ہر خانہ شد صد گلستاں

مختصر یہ کہ بخوفِ طوالت میں نے چند برادرانِ طریقت کی جودتِ طبع کا ذکر تمثیلاً کیا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ غلامانِ بارگاہِ وارثی کا میلانِ طبیعت کسی وجہ سے کیوں نہ ہو۔ مگر عموماً کلام منظوم کی جانب زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن اس قدر تفریق ضرور دیکھی ہے کہ بعض ارادتمندوں نے گاہ بگاہ منظوم عرضداشت پیش کی اور کسی نے متواتر قصائد لکھے۔ اور کثرت مزاولت کے باعث شاعر اور اس فن کا ماہر ہو گیا۔

ہدایات مذہبی اور اسی کے ساتھ یہ بھی لازمات سے تھا کہ مداحین کو۔ ان کی طلب مراد اور ریاضت و استعداد کے اعتبار سے۔ ایسے ایسے انعامات بھی مرحمت ہوتے تھے۔ جو بظاہر بھی ممتاز۔ اور درحقیقت معنوی برکات سے مملو ہوتے تھے۔ مثلاً مادح کو پہلا، استفادہ یہ ہوتا تھا کہ ایک خاص وقت تک وہ فیضانِ صحبتِ وارثی سے مستفیض ہوتا تھا۔ اور یہ ایسا بے بہا انعام۔ اور گرانقدر منفعت ہے جس کی مولانا روم علیہ الرحمۃ نے یہ صراحت فرمائی ہے۔ "بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا"

دوئم یہ کہ حضور قبلۂ عالم کا تخاطب میسر ہوتا تھا۔ اور اس مخاطبت سے جو تصفیۂ قلب

اور تزکیہ روح ہوتا تھا۔ وہ ایسا پُر اسرار فائدہ تھا۔ جس کی حقیقت کا اظہار معروف الفاظ میں نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس معنوی یافت کو اگر اشارۃً گونگے کے خواب سے تعبیر کریں تو حسب حال ہوگا۔ چنانچہ اسی کیفیت کو حافظ شیراز علیہ الرحمۃ نے استعارۃً کے طور پر فرمایا ہے۔

زمرغ صبح ندانم کہ سوسن آزاد چہ گوش کرد کہ بادہ زبان خموش آمد

سوئم یہ کہ سرکار عالم پناہ کو چونکہ کلام منظوم زیادہ پسند تھا۔ اس لئے مداحین کی رنگین بیانی اور مضمون آرائی سے آپ بہت مسرور ہوتے تھے۔ اور ارباب طریقت کا اتفاق ہے کہ اپنے رہنمائے کامل کو خوش کرنا اس کی بین دلیل ہے کہ مرید مقبول اور کامیاب ہوتا ہے جس کی تمثیل کے واسطے حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ کے مشہور واقعات کافی ہیں۔

یا کسی مداح کو حضور قبلۂ عالم اپنا ملبوس خاص مرحمت فرماتے تھے۔ جس کو اصطلاح صوفیہ میں خرقۂ تبرک کہتے ہیں۔ اور مرید صادق کے فخر و مباہات کے لئے وہ بہترین سرمایہ ہوتا ہے۔

یا کسی مداح کے حق میں کوئی امتیازی جملہ آپ ایسا فرماتے تھے۔ جو اس کے اعزاز اور اختصاص کے واسطے کافی ہوتا تھا۔ مثلاً کسی کی نسبت متبسم لبوں سے یہ فرمایا کہ "تم اپنے وقت کے امیر خسرو ہو۔ کسی سے فرمایا کہ تمہارا یہ قصیدہ تمہاری محبت کا شاہد ہے۔"

ایک مرتبہ مولوی لطافت حسین صاحب وارثی متوطن شیخپورہ ضلع مونگیر نے ایک معرکۃ الآرا قصیدہ پیش کیا۔ اس کو سُن کے آپ بہت محظوظ ہوئے۔ اور ارشاد ہوا کہ "لطافت جو پیر کے صفات کو محبت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کو آخر میں ذات کا مشاہدہ ہوتا ہے۔"

یا وہ مضمون سُن کے جس میں مداح کوئی استدعا کرتا تھا۔ سرکار عالم پناہ۔ اس کو کوئی ایسی ہدایت فرماتے تھے جو اس کی کامیابی کے واسطے مجرب عمل ہوتا تھا۔ جیسا کہ ایک صاحب نے عید کے روز التماس کے نام سے ایک نظم پیش کی۔ جس کے آخر میں اشارۃً اپنی پریشانی کا بھی ذکر کیا تھا۔ حضور قبلۂ عالم نے فرمایا۔ "جو شخص سورۂ فلق بکثرت پڑھتا ہے اس کی روزی میں برکت ہوتی ہے۔ تم بھی پڑھا کرو۔"

ایک عقیدت شعار نے نظم کے پردہ میں۔ اپنی خرابی صحت کا اظہار ایسے خوشنما طریقہ سے کیا تھا کہ حاضرین متاثر ہو گئے تھے۔ سرکار عالم پناہ نے فرمایا "ہم نے سنا ہے کہ جو اہتمام کے ساتھ سوتے وقت آیۃ الکرسی" پڑھ لیتا ہے۔ اس کی جسمانی تکلیف رفع ہو جاتی ہے"۔

میر اولاد علی صاحب وارثی۔ رامپوری کو ایک قصیدہ کے صلہ میں حضور قبلہ عالم نے یہ ہدایت فرمائی کہ "نماز عشاء کے بعد تسبیح فاطمہ پڑھا کرو۔ باایمان مروگے"۔

ایک مرتبہ ریاض خاں صاحب وارثی متخلص بہ فروغ۔ رئیس شاہجہاں پور نے ایک مسئلہ پیش کیا۔ جس کا اختتام طلب محبت پر ہوا تھا۔ سرکار عالم پناہ نے متبسم لبوں سے بکمال شفقت فرمایا" خاں صاحب تم نماز کی پابندی کرو۔ اگر کبھی کوئی عذر قوی ہو تو اشارہ سے ادا کرنا۔ مگر قضا نہ ہو۔ اور ہر نماز کے بعد چار سو اسی مرتبہ اسم ذات پڑھ لیا کرو۔ جس کے اول و آخر درود بھی ہو" یہ فرما کر رخصت کر دیا۔

خاں صاحب کے جانے کے بعد قاضی بخشش علی صاحب نے جو بہت شوخ مزاج مشہور تھے۔ دست بستہ عرض کیا کہ حضور اس میں کیا راز ہے کہ خاں صاحب کو چار سو اسی مرتبہ پڑھنے کا حکم ہوا۔ اگر بیس مرتبہ اور بڑھا دیا جاتا۔ تو ان کے پانچسو کے شمار کرنے میں زیادہ آسانی ہوتی۔

سرکار عالم پناہ نے فرمایا کہ" اس امت پر خدا کی مخصوص رحمت یہ ہے کہ ایک نیکی کرو۔ تو دس نیکیوں کا ثواب پاؤ۔ اس لحاظ سے یہ ہر نماز کے بعد چار سو اسی مرتبہ پڑھیں گے تو روزانہ کی تعداد دو ہزار چار سو ہو گی اور اس تعداد کو دس میں ضرب دوگے۔ تو کل چوبیس ہزار ہوں گے، اور صوفیہ کی یہ متفقہ رائے ہے کہ تندرست انسان شب و روز چوبیس ہزار دفعہ سانس لیتا ہے۔ اس اعتبار سے خاں صاحب کا شمار ان ذاکرین میں ہو سکتا ہے جو ہر سانس میں ذکر اسم ذات کرتے ہیں۔ اور جس کی کوئی سانس ذکر الہٰی سے خالی نہیں جاتی وہ انوار احدیت کا مشاہدہ کرتا ہے۔

مگر یہ سلسلہ ہے کہ اہل دنیا کی آسانی کے واسطے کیا جاتا ہے۔ ورنہ فقیر جب اسم

ذات کا زبانی ذکر کرتا ہے تو اس کو ہر روز چوبیس ہزار ہی مرتبہ پڑھنا پڑتا ہے۔ تب لقدر حیثیت اسرار حضرت احدیث سے ظاہر ہوتا ہے۔

نماز کی ہدایت بلکہ اسلام میں جس طرح باعتبار دیگر فرائض کے۔ نماز کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسی طرح اخوان ملت کی مستند روایات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضور قبلۂ عالم نے نماز کی ہدایت میں ہمیشہ مزید تاکید فرمائی ہے۔ چنانچہ چودھری خدا بخش صاحب وارثی۔ متوطن اٹاوہ۔ جو بہت قدیم۔ اور نہایت صادق العقیدت حلقہ بگوش تھے۔ وہ ناقل ہے کہتے کہ ایک سال امساک بارش کی وجہ سے عموماً لوگ پریشان تھے۔ اسی دوران میں سرکار عالم پناہ آگرہ سے شکوہ آباد میں تشریف لائے۔ تو سب نے حالت اضطرار میں عرض کیا کہ حضور پانی نہیں برستا۔ ہمارے کھیت سوکھے جاتے ہیں اگر دو چار روز بھی یہی حالت رہی تو ہم خانماں برباد ہو جائیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ "خدا کو عجز بہت پسند ہے۔ توبہ کرو۔ اور پابندی کے ساتھ نماز پڑھا کرو۔ کیونکہ نماز سراپا عجز کی تصویر اور عبدیت کی نشانی ہے۔ وہ رحم کرے گا" یہ سن کے سب نے توبہ کی۔ اور نماز کی پابندی کا عہد کیا۔ دوسرے روز پانی برسا اور پیداوار بہت ہوئی۔

علیٰ ہذا منشی تفضل حسین صاحب وارثی۔ وکیل اوناؤ۔ جن کے صدق ارادت کا یہ خاص ثمرہ تھا کہ جب حضور قبلۂ عالم اس راستہ سے گزرتے تھے تو اُن کے ضرور مہمان ہوتے تھے۔ وہ ناقل تھے کہ ایک مرتبہ موسم گرما میں سرکار عالم پناہ پنجشنبہ کے روز کانپور سے تشریف لائے۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ جمعہ کی نماز کے واسطے ہمیشہ پاپیادہ جاتے ہیں۔ اس خیال سے میں نے محلہ کی مسجد میں انتظام کیا۔ کہ دوپہر کے وقت دور جانے میں تکلیف زیادہ ہوگی۔ جب لوگ جمع ہو گئے۔ تو میں حضور کو لے گیا۔ آپ نے مسجد کے در و دیوار کو مرمت طلب دیکھ کر فرمایا "تفضل حسین۔ کیا محلہ کے مسلمان اس مسجد کی خدمت نہیں کرتے" میں نے عرض کیا کہ اس محلہ میں کوئی نمازی ہی نہیں تھوڑے تامل کے بعد ارشاد ہوا کہ "تم اس

مسجد کی مرمت کراؤ اور سب سے کہدو کہ جو نماز نہ پڑھے گا وہ ہمارے حلقۂ بیعت سے خارج ہے۔

اس فرمانِ وارثی کا ایسا گہرا اثر ہوا کہ ہر شخص نے نماز کی پابندی کا عہد کیا۔ اور میں نے اسی روز مرمت کرانا شروع کر دی اور ایک مؤذن بھی مقرر کر دیا۔ کچھ عرصہ کے جب سرکار عالم پناہ پھر تشریف لائے اور اسی مسجد کو مرتب اور آباد دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ "حشر کے روز یہ مسجد تمہارے سجدوں کی گواہی دے گی"

اسی مضمون کی بہت مشہور اور نہایت مستند دوسری روایت یہ ہے کہ جناب شاہ فضل حسین صاحب وارثی۔ نمبردار دیوی شریف و مسند آرائے حضرت شاہ ولایت محمد عبد المنعم قادری کنز المعرفت علیہ الرحمۃ نے۔ اکثر بکمال صراحت بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضور قبلۂ عالم کی تشریف آوری کا مژدہ سن کر ہم لوگ بستی کے باہر شاہ اویس کے باغ میں بغرض حصول قدمبوسی حاضر تھے۔ جب سرکار عالم پناہ کی سواری قریب آئی۔ اور آپ نے اہل قصبہ کو مجتمع دیکھا۔ تو پالکی سے اُتر کر پہلا جملہ جو ارشاد فرمایا وہ یہ تھا۔

"فضل حسین سب سے کہدو کہ جو نماز نہ پڑھے گا۔ وہ ہمارے حلقۂ بیعت سے خارج ہے"

ایک روز حاجی اوگھٹ شاہ صاحب وارثی نے حضور قبلۂ عالم کو مخاطب پاکر عرض کیا کہ حضور اکثر لوگ نماز نہیں پڑھتے۔ ارشاد ہوا کہ "نماز ضرور پڑھنا چاہیئے۔ یہ نظامِ عالم ہے اگر یہ چھوڑ دی جائے گی تو نظامِ عالم میں خرابی آجائے گی"

مولوی علی احمد صاحب وارثی۔ وکیل و رئیس آگرہ جو نہایت ثقہ اور متشرع شخص تھے اُن کا بیان ہے کہ میں ہنوز داخل سلسلہ نہیں ہوا تھا کہ صرف قدمبوسی کی غرض سے حاضر خدمت ہوا۔ تو حضور قبلۂ عالم نے برجستہ فرمایا کہ "مولوی صاحب ہر شخص کو شریعت کی پابندی اور سُنت کی اتباع لازمی ہے۔

قاضی منیر عالم صاحب وارثی۔ مختار۔ جو زیادہ پابند انظلم تھے۔ دربھنگہ میں

ان کے مکان پر حضور قبلۂ عالم تشریف لے گئے اور بعد تہبند پوشی کے بطریق ہدایت ارشاد ہوا "منیر عالم نماز سے عبد و معبود کا امتیاز ہوتا ہے۔ جس کی ہیئت مجموعی، عبدیت کی عین تصویر ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو سرنگوں ہے وہ بندہ ہے۔ اور جس کے آگے یہ ناک رگڑتا ہے۔ وہ خدا ہے۔ اس لئے بندہ کو بندگی لازم ہے۔"

منیر عالم نے دست بستہ عرض کیا انشاء اللہ اس ارشاد کی پوری تعمیل آج سے کروں گا۔ اور اس ہدایت کو آب زر سے لکھ کر اپنے خاندان میں چھوڑ جاؤں گا۔ جو حضور کی تشریف آوری کی یادگار رہے گی۔ لیکن بندہ نواز اسی کے ساتھ یہ بھی عرض کروں گا کہ پنجتن پاک کے صدقے میں اس کے عمل کی توفیق بھی مرحمت ہو۔ فرمایا۔ "اللہ مالک ہے۔"

اس روز سے منیر عالم نماز کے ایسے دلدادہ ہوئے کہ ماسوائے فرائض پنجگانہ کے چاشت و اشراق کے بھی پابند ہو گئے۔ حتیٰ کہ ظہر کی نماز کے بعد وظیفہ پڑھنے میں قلب کی حرکت بند ہونے سے دفعتاً انتقال ہوا۔

الغرض ایسے واقعات بکثرت ہیں جن سے نماز کے ساتھ حضور قبلۂ عالم کی دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ بلکہ جب نماز کی اہمیت کا آپ ذکر فرماتے تھے۔ تو اس سلسلہ میں بعض مسائل نماز بھی بکمال وضاحت ارشاد ہوتے تھے۔ چنانچہ منشی نادر حسین صاحب وارثی نگرامی سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضور قبلۂ عالم نگرام میں میرے غریب خانہ پر قیام پذیر تھے۔ جمعہ کے روز بعد زوال کے آپ نے وضو کیا۔ اور چار رکعتیں بستر کے قریب پڑھیں اور ارشاد ہوا کہ "نادر حسین تم کو تو معلوم ہوگا کہ سنتیں مکان پر پڑھ کر جمعہ کی نماز کے واسطے جانا مسنون ہے۔"

ایک مرتبہ حضور قبلۂ عالم شاہجہاں پور میں حکیم کلن خاں صاحب وارثی کے یہاں تھے جمعہ کے روز باوجود ضعف پیرانہ سالی کے پا پیادہ مسجد تک جانے کا قصد فرمایا۔ حکیم صاحب نے عرض کیا کہ تمازت آفتاب سے زمین بہت گرم ہے۔ حضور پالکی پر تشریف

لے جائیں۔ سرکار عالم پناہ نے فرمایا کہ "صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ مسافت مسجد کو پیدل طے کرنے سے۔ ہر قدم پر ایک ثواب ملتا ہے۔"

ایک مرتبہ حضور قبلۂ عالم بانکی پور میں خان بہادر مولوی سید فضل امام صاحب کے مہمان تھے۔ آپ نے جمعہ کے روز مسجد میں جانے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ خان بہادر نے ملازمین کو حکم دیا کہ پالکی تیار رہے۔ خدام حضرت نے سمجھا دیا کہ سواری کا اہتمام نہ کرو۔ جناب والا کا دستور ہے کہ نماز جمعہ کے واسطے پاپیادہ جاتے ہیں۔ خان بہادر نے بہت قریب ایک مسجد تھی اس میں نماز کا انتظام کیا۔ اور اس مسجد میں سب لوگ آپ کے ہمراہ پاپیادہ گئے۔ بعد نماز کے جب آپ جائے قیام پر واپس تشریف لائے تو فرمایا۔ "فضل امام تم نے تو اپنی محبت کا حق ادا کیا۔ کہ ہم کو دور نہیں جانے دیا۔ مگر یہ نقصان ہوا کہ آج کی مزدوری کم ہو گئی۔"

مولوی سید عبد الغنی صاحب وارثی بہاری۔ مترجم طبقات الکبریٰ ناقل تھے کہ بلیھی کے دوران قیام میں آپ نے جمعہ کے روز غسل فرمایا اور ارادتمندوں سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا کہ "علماء کے گروہ میں یہ مسئلہ ہنوز تصفیہ طلب ہے کہ ہندوستان کو دار الحرب سمجھا جائے یا دار الاسلام۔ اس وجہ سے نماز جمعہ کے وجوب میں بھی اختلاف ہے۔ اور اکثر اشخاص بعد نماز جمعہ کے چار رکعتیں ظہر کی پڑھ لیا کرتے ہیں۔ مگر یہ صریح شرک ہے اور عبادت میں شک کی گنجائش نہیں یک سوئی ہونی چاہیے"

اکثر حضور قبلہ عالم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "نماز وقت پر ادا کرنا افضل اور فرمانبرداری کی نشانی ہے۔ یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ "نماز میں عمداً دیر کرنا کاہلی کی دلیل ہے۔ اور مالک کے حکم میں کاہلی عبدیت کے منافی ہے" اور یہ بھی فرمایا ہے کہ "جو شخص باوضو رہتا ہے۔ قیامت کے روز وہ پرہیزگاروں کی صف میں کھڑا ہو گا" اور یہ بھی فرمایا ہے

کہ "اعضائے وضو قیامت کے روز نورانی ہوں گے۔"

یہ ارشادات اور مثل اُن کے۔ اور متعدد ہدایات ایسی ہیں جن کا مفہوم بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور قبلۂ عالم نے بصورت ہدایتِ عامہ۔ حقائق طریقت کے ساتھ۔ فرائض شریعت کی بھی بکمال تاکید تبلیغ فرمائی ہے۔ اور چونکہ نماز کو اپنی اہمیت کے لحاظ سے وہ تخصیص حاصل ہے جو دیگر فرائض میں نہیں پائی جاتی۔ اس واسطے جملہ مریدین سے مخاطب ہو کر آپ نے اس کی پابندی کا بہ اصرار حکم دیا۔ اور اس فرضِ عام اور قطعی کی ہدایت میں یہ خاص اہتمام فرمایا کہ ترغیب کے ساتھ بغیر کسی تخصیص و تفریق کے بطور ترہیب یہ ارشاد ہوا کہ جو نماز نہ پڑھے گا وہ ہمارے حلقۂ بیعت سے خارج ہے۔"

جس کو دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ سرکارِ عالم پناہ کو مذہب اور مشرب کی پابندی چونکہ نہایت پسند اور غائت مرغوب تھی۔ اس لئے منظور ہوا کہ اس فرض لازمی کی خاص و عام کامل نگاہ داشت کریں۔ تاکہ ہمارے جملہ مریدین صورتاً و سیرتاً مہذب و مؤدب ہو جائیں۔

لیکن بعض ملفوظات جن میں نماز کی فرضیت کا ذکر اور اس کی پابندی کا حکم قطعی گو اسی طرح نمادر ہوا ہے۔ مگر ان میں ضمناً کوئی ایسی لفظ زائد بھی ہے جس کے سیاقِ عبارت کو غور و تامل سے دیکھتے ہیں۔ تو اس ہدایت کی دوسری شان یہ نظر آتی ہے کہ حضور قبلۂ عالم نے جس عنوان سے مسترشدین کو ان کے جذبات و کیفیات کے اعتبار سے طریقت کی تعلیم بالترتیب اور ان کے حسب حال استعداد فرمائی ہے۔ اسی طریقہ سے اپنے ارادتمندوں کو احکام شریعت سے بھی بالتفصیل خبردار کیا ہے۔ اور مذہبی عبادت کی تبلیغ اور ترغیب بھی اسی صورت سے فرمائی ہے جس کے وہ اہل اور سزاوار تھے۔

چنانچہ یہ مستند ملفوظ جس کو دیگر مؤلفین سیرت وارثی نے بھی نقل کیا ہے کہ دربھنگہ کے دوران قیام میں ایک روز مولوی عبد الکریم صاحب وارثی متوطن شیخوپورہ ضلع مونگیر

نے نماز کی خصوصیت دریافت کی۔ حضور قبلۂ عالم نے فرمایا۔ مولوی صاحب نماز وہی ہے جو حضورِ قلب کے ساتھ ہو۔"

اگر نظر تامل سے دیکھا جائے تو اس ارشاد کا مفہوم۔ ہدایات مذکورہ بالا سے ایک حد تک ممتاز اور بلند معلوم ہوتا ہے۔ اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سرکار عالم پناہ نے اس فرض قطعی کی تعلیم میں بھی مسترشدین کی حالت اور کیفیت کا لحاظ فرمایا ہے۔ کیونکہ پہلے ارشادات کا چونکہ عام مریدین سے تخاطب تھا۔ اس لئے صرف اطاعت جسمانی سے مکلف کیا تھا اور اس ملفوظ میں کسی قدر روحانیت کو بھی دخل ہے۔ کیونکہ "حضورِ قلب" سے انہیں ارادتمندوں کی نماز مشروط ہو سکتی ہے۔ جن کے قلوب اثراتِ محبت سے گونہ متاثر اور گداز۔ اور مذاقِ تصوف سے بقدر حیثیت مانوس ہو چکے تھے۔

اور اسی مضمون کو آپ نے دوسرے الفاظ میں یوں فرمایا ہے کہ "نماز میں خضوع اور خشوع لازمی ہے۔ جن سے نماز۔ واقعی نماز ہو جاتی ہے۔" اور یہ بھی فرمایا ہے کہ "نماز مومنوں کی معراج ہے۔ کیونکہ ایک قسم کی حضوری نصیب ہوتی ہے۔" اور یہ بھی فرمایا ہے کہ "جس کا خیال جس قدر پختہ ہوگا۔ اُسی قدر اس کو حضوری کا لطف حاصل ہوتا ہے۔" اور یہ بھی فرمایا ہے کہ "نماز روح کی غذا ہے۔"

یہ ارشادات زبان حال سے شاہد ہیں کہ ان ہدایات کا روئے سخن متمیز اور شائستہ خیال مریدین کی جانب ہے۔ اس واسطے جسمانی عبادت کے ساتھ۔ قدرے اور مختصر روحانی جدوجہد بھی شامل ہے۔

اور اسی مناسبت سے ایک مرتبہ۔ آگرہ کے قیام میں حافظ خدا بخش صاحب سے جو فرائض پنجگانہ کے ساتھ سنن و نوافل کے بھی پابند تھے اور جن کو آخر میں احمد شاہ کا ممتاز خطاب تفویض ہوا۔ اور بعد انتقال کے بھی جو صحن آستانۂ اقدس میں دفن ہوئے۔ سرکار عالم پناہ نے فرمایا۔ حافظ جی جس طرح چاشت اور اشراق کے پابند ہو۔ اسی طرح

شب کو نماز معکوس بھی پڑھا کرو"۔

ایک مرتبہ مولوی سید محمد یوسف صاحب وارثی۔ مختار و رئیس۔ مضافات بہار نے دست بستہ اور آبدیدہ ہو کر عرض کیا کہ سرکار۔ مجھ ایسے سیہ کار کے دل میں بھی طلب الٰہی کی صلاحیت آسکتی ہے۔ ارشاد ہوا "جس کو یقین ہوتا ہے کہ حالت نماز میں۔ خدا مجھ کو دیکھتا ہے۔ اس کو ضرور مشاہدہ انوار الٰہی کا شوق ہو جاتا ہے اور جس کا شوق کامل اور طلب پختہ ہوتی ہے، اس کو ہر ذرہ میں محبوب کا جلوہ نظر آتا ہے"۔

ایک ارادتمند نے عرض کیا۔ بندہ نواز۔ نفس بد کیش کی سرکشی کم نہیں ہوتی۔ فرمایا "تم نماز تہجد کی نگہداشت میں ہوشیار نیند سویا کرو۔ نفس مغلوب ہو جائے گا۔ کیونکہ نفس ہمیشہ غفلت کی نیند پسند کرتا ہے"۔

ایک طالب خدا حلقہ بگوش نے عرض کیا کہ مجھ کو لباس فقر مرحمت ہو۔ ارشاد ہوا کہ ایک سال تک دن کو روزہ رکھو۔ اور شب کو نماز غوثیہ پڑھا کرو۔ اس کے بعد آنا تہبند بھی مل جائے گا"۔

عبدالصمد وارثی۔ متوطن مسولی۔ ضلع بارہ بنکی نے عرض کیا کہ حسب معمول نفی و اثبات کا ذکر کرتا ہوں۔ مگر وہ جوش نہیں پیدا ہوتا کہ گھر میں آگ لگا دوں۔ ارشاد ہوا کہ "آخر شب میں صلوٰۃ العشق پڑھا کرو۔ بقدر ضرورت جوش پیدا ہو جائے گا"۔

غرض ارشادات متذکرہ صدر کے نمایاں طور پر دو مذاق اور دو مدارج نظر آتے ہیں پہلی ہدایتوں کا تخاطب نو آموز ارادتمندوں کی جانب معلوم ہوتا ہے اور دوسرے ارشادات کا روئے سخن ان طالبین کے احوال سے مناسبت رکھتا ہے جو سفر سلوک کی پہلی منزل میں خیمہ زن ہیں۔

لہٰذا یہ مسلہ ہے کہ رہروان، وادی محبت کی طلب صادق ہی مبدا ر فیاض جس قدر پختگی تفویض فرماتا ہے۔ اسی قدر ان کے عادات و معاملات۔ صدق و خلوص سے

مؤدب۔ اور شائستہ اور عبادات دریاضات حقانیت وروحانیت سے مہذب وآراستہ ہوجاتے ہیں اور اسی مناسبت سے رہبر کامل ان کا نصاب تربیت وہی تجویز کرتا ہے جس کو معنوی برکات وخصوصیات سے زیادہ سروکار رہتا ہے۔

صلوٰۃ العاشقین

چونکہ صفات ناسوتی کا ازالہ رفتہ رفتہ ہوتا ہے اور اسی لحاظ سے اخلاق ملکوتی بھی جستہ جستہ مرحمت ہوتے ہیں۔ اس واسطے سالک کے جسمانی عبادات میں روحانی ریاضات کا اشتراک بتدریج کیا جاتا ہے۔ آخر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ انہیں طالبین نوآموز کی وہی نماز جو ارکان ظاہری پر ختم ہوتی تھی۔ ان کے صفائے باطن اور افراد یافتہ کے اعتبار سے امتیاز قرب ومعیت سے موسوم اور اعزاز وخصوصیت سے موصوف ہوجاتی ہے۔

چنانچہ وہ بلند خیال۔ گرویدۂ جمال حضرت ذوالجلال۔ مردمیدان تجرید آشنائے بحر توحید۔ جو بعد انقطاع تعلقات موجودات۔ جملہ خواہشات ومرادات سے دست کش اور معلومات ومعقولات سے فارغ ہوکر جوش تسلیم میں سرکف۔ ہمہ وقت تجلیات انوار شاہد بے نیاز کے مشاہدہ میں محو ومستغرق رہتے ہیں ان کی نماز باوجودیکہ بظاہر نماز مروجہ کی ہم صورت ہی کیوں نہ ہو۔ مگر فی الحقیقت صدق وخلوص سے مملو۔ اور عجز ونیاز سے ایسی معمور ہوتی ہے جس کے شرف واختصاص کا انحصار مشکل اور دشوار ہے۔

اور واقعی ان سراپا نیاز نماز گذاروں کی ممتاز نماز کی حقیقت اور ماہیت سے آگاہ اور خبردار ہونے کے۔ ہم سبہ کار اپنی عدم اہلیت کے اعتبار سے۔ ہرگز مستحق اور سزاوار نہ تھے مگر ہمارے آقائے نامدار نے محض اپنی عنایت سے اس گراں قدر نماز کے بھی۔ بعض فروعی نکات اور سطحی صفات کا مخصوص اوقات میں مجملاً ذکر تو اکثر فرمایا۔ لیکن ایک مرتبہ یہ ہیچمداں حاضر خدمت تھا کہ حضور قبلہ نے عارفین باتمکین کی نماز پنجگانہ کے صفات اس وجہ سے کسی قدر وضاحت کے ساتھ عام فہم الفاظ میں ارشاد فرمائے کہ

مخاطب شائستہ خیال اور ذی ہوش۔ بارگاہ وارثی کا حلقہ بگوش تھا۔ جس کے تبحر بلکہ تقدس کا بھی یار و اغیار اعتراف و اقرار کرتے تھے۔

لیکن بدقسمتی سے۔ سرکار عالم پناہ کا وہ مشرح اور بسیط ملفوظ۔ بقید الفاظ۔ اور اسی عنوان سے بہ تسلسل صفات۔ میرے حافظہ میں محفوظ نہیں رہا۔ گو بطور افکار شنیدہ مفہوم پیش نظر ہے۔ اور ماحصل اس کا ضرور یاد ہے مگر یہ بے وقعت یادداشت بھی اس وجہ سے اس فراموشی سے زیادہ بے کار معلوم ہوتی ہے کہ اس مضمون کو اگر اپنی زبان میں قلمبند کرتا ہوں تو یہ نقص ہے کہ حضور قبلۂ عالم کا مخصوص ارشاد بجائے باللفظ ہونے کے بالمعنی ضبط تحریر میں آتا ہے۔ اور یہ بھی بعید نہیں کہ بعض صفات چھوٹ جائیں اور تسلسل توضیح منقطع ہو جائے گا۔

تاہم اس ملفوظ کا مفہوم، مطلب۔ جس قدر بھی مجھ کو یاد ہے صرف اس خیال سے نقل کرتا ہوں کہ باوجود ان جملہ نقائص کے غلامان بارگاہ وارثی کو میری اس ناتمام اور بے ربط عبارت کے مطالعہ سے بھی اس قدر واقفیت ضرور ہو جائے گی کہ عاشقان جانباز کی نماز کبھی ظاہری قیود و شروط کے ساتھ۔ اور کبھی باطنی عجز و نیاز سے معمور ہوتی ہے۔ اور ارباب طریقت نے ان کے اس سوز و گداز کو عین نماز فرمایا ہے۔

چنانچہ غالباً سنہ ۱۳۰۱ھ کا واقعہ ہے کہ حضور قبلۂ عالم لکھنؤ میں قیام فرما تھے کہ ناگاہ مولانا وصوفی ہدایت اللہ صاحب وارثی۔ محدث سورتی۔ جو علامۂ وقت بھی تھے۔ اور اہل دل بھی اور باعتبار شہرت عام آج بھی جن کا نام نامی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ بغرض حصول شرف قدمبوسی، حاضر خدمت اقدس ہوئے اور پہلے اپنے بعض شکوک کا ذکر کیا۔ بعدہ بہ استیلائے ادب عرض کیا کہ قبلۂ ما، عاشقان صادق کی نماز پنجگانہ کے حقیقی صفات اور واقعی تعریف کیا ہے۔

سرکار عالم پناہ نے ارشاد فرمایا۔ مولوی صاحب۔ عاشقوں کا نماز و حقیقت ایک

اور مقصود واحد ہوتا ہے۔ لیکن واردات قلبی کی وجہ سے ان کے جذبات کبھی مختلف بھی نظر آتے ہیں۔ اور وہ جانباز اکثر بااقتضائے احوال نماز ادا کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی نماز کی وہ تعریف جو بطور کلیہ کے ہو دشوار ہے۔

لیکن بہ لحاظ مدارج عاشقانِ الٰہی کے دو گروہ زیادہ مشہور ہیں۔ کیونکہ دونوں کے خیال اور مذاق میں بھی کچھ تفاوت ہے اور دونوں کی نماز میں بھی بظاہر گونہ تفریق ہے۔ چنانچہ ان خدا پرستوں میں ایک گروہ وہ ہے۔ جس کے جملہ افراد۔ شوق دیدار یار میں تعلقات موجودات سے دست بردار بھی ہوتے ہیں اور ہر حال میں بکمال استقلال تسلیم شاہد غیبی کے پابند اور رضائے مطلوب حقیقی کے آگے سرنگوں بھی رہتے ہیں، مگر چونکہ تفریغ میں قطعی تکملہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس قدر گنجائش رہتی ہے کہ مجبوراً یا ضرورتاً یا اور کسی ذاتی خیال سے۔ یا بہ نظر تعمیل ہدایت مرشد۔ یا شرعی خدمات کے باعث۔ یا اشاعت دین کی غرض سے کسی ایک تعلق سے ان کو نمٹنا سروکار رہتا ہے۔ اسی مناسبت سے ان کے معاملات میں سے کسی معاملہ میں تنظیم کا شعبہ بھی شامل ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ حق نیوش۔ باوجودیکہ جوش عشق میں سراپا مدہوش ہی کیوں نہ ہوں مگر ان کی نماز میں یہ نظم ہے کہ بظاہر ارکانِ مقررہ کے مطابق اور بہ باطن مشترک بہ خلوص اور مشتمل بہ نیاز ہوتی ہے۔ بقول۔

مرا غرض ز نماز آں بود کہ یک ساعت غم فراق ترا با تو راز بگزارم
دگرنہ ایں چہ نماز بود کہ من بے تو نشستہ روئے بمحراب دل بہ بازارم

مختصر یہ کہ ہمیشہ وہ صاحب احتیاط قیود ظاہری کے ساتھ شروط معنوی کی بھی تعمیل کرتے ہیں۔ مثلاً وہ رضا جو۔ قیود معینہ کی تعمیل کے علاوہ۔ وضو کرنے میں شرائط حقیقی کی بھی بحدِ اہتمام پابندی کرتے ہیں کہ بہزار اہتمام اپنا ظاہر میل ہوا و حرص سے صاف۔ اور باطن وسواس خودی اور خطرات دوئی سے پاک کرکے۔ احکام معبود مطلق کی بجا آوری

کے واسطے ہمہ تن مستعد رہتے ہیں۔ بقول

پس وضو چیست۔ فکر کردن دل　　　صافی دل۔ جدا شدن ز اغیار

معہذا ان کی نماز میں یہ بھی غیر معمولی اہمیت ہوتی ہے کہ ارکانِ ظاہری کی تعمیل میں
اعضائے جسمانی کے ساتھ ان کے قوائے روحانی بھی اطاعت آلٰہی میں منہمک اور
مصروف ہو جاتے ہیں۔ یعنی قیام وقعود۔ رکوع و سجود میں وہ جان باز بصد عجز و نیاز اور
بکمال شوق و ذوق۔ دنیا و مافیہا کے خیال سے فارغ البال ہو کر شہود انوار حضرت
واجب الوجود میں ایسے محو اور مستغرق ہو جاتے ہیں کہ شدائد آلام کا بھی ان کو احساس
نہیں ہوتا جو صدق کی عین تعریف ہے

چنانچہ حضرت رابعہ بصری کا یہ مشہور قول ہے کہ "لَیْسَ بِصَادِقٍ فِیْ دَعْوَاہُ
مَنْ لَمْ یَنْسَ اَلَمَ الضَّرْبِ فِیْ مُشَاهَدَةِ مَوْلَاهُ" یعنی وہ اپنے دعوے میں
سچا نہیں ہے جو خدا کی دی ہوئی تکلیف کو بھول نہ جائے مشاہدہ مطلوب میں۔

شاید اسی نظام کو علمائے عظام نے "معراج المومنین" فرمایا ہے۔ لیکن حضرات
صوفیائے کرام کی خاص اصطلاح میں ایسی نماز کو "صلوٰۃ الشہود" اور صلوٰۃ الوصال
بین الفراق" کہتے ہیں اور اس نماز کی تعلیم بھی بارگاہ حضرت مرتضوی سے ہوئی ہے اور ہوتی
ہے۔ مگر بہ باطن اور مخصوص مشتاقین کو۔ ۱

کیونکہ محققین ارباب طریقت کو حضرت حسن بصری علیہ الرحمۃ سے معلوم ہوا ہے کہ
جب سر حلقہ عشاق اسد اللہ الغالب علی ابن ابی طالب علیہ التحیۃ والثنا کے مجروح
پائے مبارک سے جراح نے تیر پیوستہ نکالا اور آپ بدستور نماز میں مصروف رہے۔
اور خلاف فطرت بشری اس دلخراش تکلیف کی خبر نہ ہوئی۔ تو بعض خدام متعجب مستفسر حال
ہوئے تو شہنشاہِ ولایت نے ان کو صلوٰۃ الشہود تعلیم فرمائی اور بکمال شفقت ارشاد
ہوا کہ ہمارے اکثر متوسلین اس فیض سے ہمیشہ بطریق اویسیہ مستفیض ہوا کریں گے۔

اور عاشقانِ صادق کا دوسرا طبقہ جس کے رکن رکین۔ ایسے عارفین و مقربین اور جلیل القدر و کبیرالشان ارباب تجرید و اصحاب تفرید ہوتے ہیں۔ جن کے معنوی واردات۔ اور دائمی کیفیات سے اکثر عجیب و غریب برکات و تصرفات کا اظہار ہوتا ہے۔ مگر باایں ہمہ وہ آزاد منش اپنی رندانہ روش کی وجہ سے جو بجہت اخفا اور استتار پسند اور اختیار فرماتے ہیں۔ دنیا میں۔ غوث و قطب کے ممتاز خطابات سے مشہور نہیں ہوتے۔ حالانکہ حضرات صوفیائے کرام۔ اپنا پیش رو اور امام جانتے ہیں۔ کیونکہ یہ مسلمہ ہے کہ درحقیقت ان کی کیفیت اختیاری و اکتسابی نہیں، بلکہ ازلی اور وہبی ہوتی ہے۔

چنانچہ ارباب طریقت کا اتفاق ہے کہ جن خدا پرستوں کی مقدس روحیں بہ ہنگام عہد الست۔ افراط مشاہدۂ انوار شاہد حقیقی سے زیادہ سرشار و مست ہو چکی ہیں۔ ان کا سکر و سرور عالم امکان میں بھی بدستور رہتا ہے اور وہ دائمی گرفتار محبت اپنی ازلی کیفیت کے باعث دنیا میں بے تعلق اور آزاد۔ خودی سے بے خود۔ دوئی سے دور۔ نام و نمود۔ سود و بہبود سے ہمیشہ محترز و متنفر رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ بجز سوز و گداز۔ ان عزلت نشینوں کا کوئی جلیس و دمساز بھی نہیں ہوتا۔ اور اگر وہ دلفگار کبھی حالت اضطرار میں اپنے اصول مذہب اور طریق مشرب کا اظہار کرتے ہیں۔ تو بے ساختہ زبان حال سے کہتے ہیں۔ بقول

فاش می گویم و از گفتۂ خود دلشادم　　　بندۂ عشق و از ہر دو جہاں آزادم

اور اسی مناسبت سے ان کی طاعت اعراض و اغراض سے خالی اور عبادت قلبی و حالی ہوتی ہے۔ یار و اغیار کو یکساں۔ رنج و راحت کو مساوی جانتے ہیں۔ بجز حکایت عشق و ذکر محبت۔ نہ کسی کے عقائد سے بحث نہ ملت سے گفتگو۔ نہ مذہب شیخ سے انکار نہ مشرب برہمن سے تکرار کرتے ہیں۔ بقول۔

عاشق ہم از اسلام خراب است و ہم از کفر　　　پروانہ چراغ حرم و دیر ندانند

نہ ان کو خلق سے واسطہ نہ مخلوق سے سروکار ماسوائے یار تمام عالم سے دست بردار

یادِ محبوب و تصور مطلوب ہیں۔ کامل محویت و مستقل استغراق ہونا۔ اور اسی حال میں جینا اور اسی خیال میں مٹ جانا ان کے مشرب میں بفحوائے "صَلٰوتِھِمْ دَآئِمُوْنَ" حقیقی نمازِ پنجگانہ ہے بقول مولانا علیہ الرحمۃ۔ مصرع۔ "نمازِ عاشقاں ترکِ وجود است"

چونکہ یہ پروانۂ شمعِ احدیت عالم سکر و حالتِ کیفیت ہیں۔ بغیر تشبیہ و تنزیہہ۔ اور بلا لحاظ سود و بہبود جوشِ محبت ہیں۔ ہستی معبود و مطلق کے سامنے اپنے شعور وجود کو نیست و نابود کرتے ہیں۔ جس کا نتیجہ و مآل درحقیقت یہ ہوتا ہے۔ کہ ہمہ وقت ایک ذات سے سروکار رہتا ہے۔ اسی حالت کو حضرات صوفیائے کرام کی اصطلاح میں "فنا ر الفنا" کہتے ہیں۔

لہذا ان کی افراطِ بےخودی اور اتمام بےشعوری کے اعتبار سے۔ ان مخمورانِ بادۂ الست کی نسبت باطن شناس اربابِ حقائق کا یہ خیال ہے۔ بقول

درکوئے خرابات کسے را کہ نیاز است　　　ہشیاری و مستیش ہمہ عین نماز است

خلاصہ یہ کہ بہ مناسبتِ احوال اور بمقتضائے جوشِ نیازمندی۔ یادِ خداوندی میں ہمہ وقت و بہمہ حال مصروف و مشغول رہنے کو۔ اطاعت اور عبادت سے تعبیر کیا جائے تو حسب منشائے اہلِ طریقت عقلاً و نقلاً خلاف نہیں ہے ورنہ "فِیْ صَلٰوتِھِمْ دَآئِمُوْنَ" کیونکر صادق آتا ہے۔

صفاتِ روزہ علیٰ ہذا روزہ۔ جو اسلام کا فرضِ عظیم۔ اور ایمان کا اہم بالشان رکن ہے۔ جس کا احترام حضور قبلۂ عالم اس اہتمام سے فرماتے تھے کہ قبل رویتِ ہلالِ صیام مسجد میں چونہ گردانی ہوتی تھی۔ کرنال شریف سے حافظ عبدالقیوم صاحب وارثی۔ جن کا مشہور حفاظ میں شمار تھا ختم قرآن کے لئے آتے تھے۔ شرکتِ تراویح کے واسطے ارادتمندوں کو بتاکید حکم ہوتا تھا۔ روزانہ افطاری ہر خاص و عام کو تقسیم ہوتی تھی۔ کم از کم تیس مجلد و قیمتی قرآن مجید لکھنؤ سے منگا کر حفاظ قرآن خوانوں کو عطا ہوتے تھے۔ خدام خاص کے خدمات میں آسانیاں کی جاتی تھیں۔ مقررہ شیرنت جو روزانہ آستانہ پر تقسیم ہوتی تھی۔ اس میں کافی اضافہ ہوتا تھا۔ قصبہ کے بعض شرفائے حاجت مند

کے گھروں پر کھانا بھیجنے کا فرمان صادر ہوتا تھا۔ آخر عشرہ میں غربا کو حسب حیثیت کپڑا تقسیم ہوتا تھا۔ عید کے روز علی الصباح دودھ اور سویاں بصورت لنگر تقسیم ہوتی تھیں۔ اکثر مساکین کو نقد بھی دیا جاتا تھا۔ اہلِ خدمت کو انعام ملتا تھا۔ مختصر یہ کہ رمضان مبارک کا یہ خیر مقدم زبانِ حال سے شاہد ہے کہ حضور قبلۂ عالم کو روزے سے خاص دلچسپی تھی۔

اور جس اولوالعزمی سے سرکار عالم پناہ نے روزہ رکھا ہے۔ اس کا ذکر بعض مؤلفین سیرت وارثی بصراحت کر چکے ہیں۔ اور اکثر وہ قدیم اخوانِ ملت بھی ہنوز موجود ہیں جنہوں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ پہلے آپ سات روز کے بعد خاصہ تناول فرماتے تھے۔ اس لئے مکرر اعادہ باعث طوالت ہوگا۔ مگر اس قدر عرض کرنا شاید بے محل نہ ہوگا۔ کہ ہمارے رہنمائے کامل کا روزہ بھی۔ صبر و ثبات کے لحاظ سے غیر معمولی روزہ ہے۔ جس سے آپ کے عشق صادق کی شان نظر آتی ہے۔ کیونکہ محققین حضرات صوفیہ نے محبت صادق کی یہ علامت بطور کلیہ کے بیان فرمائی ہے کہ "اَلْمَحَبَّةُ مُعَانَقَةُ الطَّاعَاتِ وَمُبَایَنَةُ الْمُخَالِفَاتِ"۔ یعنی افراطِ محبت کی صحیح اور لازمی نشانی یہ ہے کہ محبوب کی اطاعت کو گلے سے لگائے اور مخالفت سے احتراز کرے۔

چنانچہ حضور قبلۂ عالم کے مخصوص اعمال و اشغال کے ماورا۔ جن سے ہم آگاہ ہی نہ ہو سکتے ہیں روزمرہ کی طاعات و عبادات میں سے صرف روزہ ہی کو اگر گہری نظر سے دیکھتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جس عنوان سے آپ نے حضرت احدیت جل جلالہ کے اس فرمان "اَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ" کی تعمیل فرمائی ہے۔ وہ آپ کے جذبات عشق کی بیّن دلیل ہے کیونکہ مطلوب حقیقی کے اس حکم قطعی کے مطابق۔ گو آپ نے بہزار صدق و خلوص۔ ماہِ صیام کے روزے حسب قیود و شرائط رکھے۔ لیکن بدیہات سے معلوم ہوتا ہے کہ تیس دن تک۔ از صبح تا شام احتراز آب و طعام کے بعد بھی آپ کے قلبی ذوق و شوق کو سکون نہیں ہوا اور بہ اقتضائے جوشِ عشق حکم شاہد بے نیاز کی تعمیل میں "مُعَانَقَةُ الطَّاعَاتِ" کی تشریح و تصریح کو اس قدر وسیع کیا کہ بجائے بارہ گھنٹے۔ امساک خور و نوش کے جناب حضرت نے ایک سو اٹھ

گھنٹے کے بعد اکل و شرب فرمایا۔ اور اٹھارہ سال تک آپ کا مسلسل یہی دستور رہا کہ سات روز کے بعد۔ نہایت سادی اور قلیل غذا سے افطار کرتے تھے۔

اور بعض معمر ارادتمندوں کا مقولہ ہے کہ بجائے تیس دن کے۔ چوبیس سال تک اسی عنوان سے آپ صائم الدہر رہے۔ اور بکمال صبر و استقلال۔ حضرت رب العزت کے اس حکم کی ایسے پُر جوش طریقے سے تعمیل فرمائی کہ اس طاعت کو۔ ریاضت شاقہ کی حد تک پہنچا دیا۔ اور آپ کا روزہ بھی بمنزلہ مخصوص مجاہدہ کے ہو گیا۔

لہٰذا اگر ہم غلامان بارگاہ وارثی۔ جوش عقیدت کے لہجہ میں یہ عرض کریں۔ تو بالکل صحیح ہوگا کہ ہمارے عالی خیال اور بلند حوصلہ۔ آقائے نامدار کو جس طرح واہب العطیات نے بلاواسطہ عشق صادق ودیعت فرمایا اسی طرح عشق کامل کے جملہ مراحل و منازل طے کرنے میں۔ حضور قبلۂ عالم نے رضائے پنجتنی کی یہ شان دکھادی کہ خداوند عالم کا کوئی حکم طاعت و عبادت ایسا نہیں ہے جس کی تعمیل و تکمیل سرکار عالم پناہ نے کماحقہٗ اور اہمیت کے ساتھ نہ کی ہو۔

اور چونکہ یہ مسلمہ ہے کہ حضور قبلۂ عالم کو روزے سے نہایت رغبت اور غایت دلچسپی تھی تو اسی رغبت کا یہ اقتضا تھا کہ بکمال شفقت آپ نے مسترشدین کو بھی روزہ رکھنے کی ہدایت متواترہ اور بتاکید فرمائی۔ بلکہ ترغیب کے پیرایہ میں صوم رمضان کے صفات و برکات سے بھی آگاہ کیا۔ چنانچہ اکثر ارشاد ہوا ہے کہ" روزہ ایسی گرانقدر عبادت ہے کہ روزہ دار بندے کو خدا اپنے دوستوں میں شمار کرتا ہے۔" اور یہ بھی فرمایا ہے کہ" انسان حالت روزہ میں صفات ملکوتی سے موصوف ہو جاتا ہے۔" اور یہ بھی فرمایا ہے کہ خدا کی عین رحمت ہے کہ فاقہ جو اس کے نعمت خانہ میں محبوب غذا تھی۔ وہ ہر سال اپنے بندوں کو تیس روز تک مرحمت فرماتا ہے۔" اور یہ بھی ارشاد ہوا کہ" روزہ گناہوں کو مٹاتا ہے۔" اور یہ بھی فرمایا ہے کہ" روزہ رکھنے سے نفس مغلوب ہوتا ہے۔" اور یہ بھی فرمایا ہے کہ

روزہ روح کی غذا ہے۔ اور یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ" شوق سے روزہ رکھنا عاشقوں کی سنت ہے۔ اور یہ بھی فرمایا ہے کہ" روزہ رکھنے سے خدا کی محبت بڑھتی ہے۔"

اور شاید طالبانِ الٰہی کے واسطے صائم الدہر رہنا زیادہ مفید ہے۔ کیونکہ اکثر حضور قبلۂ عالم نے اسی حلقہ بگوش کو دائم الصوم رہنے کا حکم دیا ہے۔ جو خرقہ پوش۔ یا بظاہر اہلِ دنیا مگر فی الحقیقت صاحب دل اور حق کوش تھا۔ اور جب کوئی دوامی روزہ دار حاضر خدمت ہوتا تھا۔ تو سرکار عالم پناہ اس کو بہ نظرِ شفقت دیکھتے تھے اور خادم خاص کو اس کی افطاری کے واسطے تاکید ہوتی تھی۔ اور اکثر بطور ہمت افزائی یہ بھی فرماتے تھے کہ" ہم نے بھی برسوں روزہ رکھا ہے۔ روزمرہ پانی سے افطار کرتے تھے۔ اور ساتویں روز کھانا کھاتے تھے۔"

حالانکہ ایسے اخوانِ ملت کی تعداد بھی بکثرت ہے جنہوں نے حسب الحکم ہمیشہ دن کو آب و طعام سے احتراز کیا۔ یا جن سے عرصۂ دراز تک روزہ رکھوایا گیا۔ لیکن طوالت کا خوف ہے۔ اس لئے بہ لحاظ سلسلہ چند حضرات کے نام نامی تمثیلاً نگارش کرتا ہوں۔

چنانچہ رومی شاہ صاحب وارثی۔ جو ترکی النسل اور پہلے اپنے ملک میں افسر فوج تھے۔ ان کو حضور قبلۂ عالم نے لباس فقر بابیں حکم مرحمت فرمایا تھا کہ دائم الصوم اور قائم اللیل رہنا۔ اور بعد افطار بھی صرف نمک سے نانِ جویں کھانا۔

اور ولائتی شاہ صاحب وارثی افغانی۔ جن کے دیکھنے والے آج بھی موجود ہیں کہ حسب الحکم اجمیر شریف میں جھالرہ سے مشکیزہ بھر کر خلق اللہ کو پانی پلاتے تھے۔ ان کو سرکار عالم نے صوم داؤدی کا حکم دیا تھا۔ کہ ایک دن روزہ رکھو اور دوسرے روز بے طلب جو بہم پہنچے بعد ظہر کے کھالیا کرو۔ اور جس روز روزہ سے ہو آستانۂ اقدس پر جاروب کشی کرو اور جس روز کھانا کھاؤ اس روز پانی پلاؤ۔

اور بسبن وارثیہ معروف بہ اللہ والی جو آج تک اجمیر شریف میں صاحب باطن مشہور ہیں۔ اور روضۂ انور کے مشرقی سمت ان کا مزار ہے وہ جس روز سے داخل سلسلہ ہوئیں تاحیات روزہ دار رہیں۔

اور مسکین شاہ صاحب وارثی۔ جو نواح الہ آباد کے رئیس تھے۔ اور ضلع باندہ میں جن کا مزار زیارت گاہِ خلائق ہے۔ دائم الصوم اور قائم اللیل تھے۔

سماۃ نصیبن وارثیہ ہمیشہ روزہ دار رہیں اور کھانا تیسرے دن کھایا۔ وہ اس طرح کہ چرخہ کات کر جس قدر پیسے جمع ہوتے تھے۔ ان میں سے نصف پہلے خیرات کرتی تھیں۔ اور نصف اپنے سوم سر روزہ کے افطار کرنے میں صرف کرتی تھیں۔

اور مخدوم شاہ صاحب وارثی متوطن موا سینی متصل دریاباد۔ بارگاہِ وارثی کے قدیم حلقہ بگوش تھے وہ ایسے روزے کے دل دادہ تھے کہ حالتِ صوم میں جاں بحق تسلیم ہوئے۔

اور رمضان شاہ صاحب وارثی فتحپوری۔ وہ ایسے اسم بامسمیٰ روزہ دار تھے کہ روزہ افطار کرنے میں دار القرار کا سفر کیا۔

اور حاجی مکی شاہ صاحب وارثی۔ ان کا بھی یہ دستور تھا کہ تیسرے روز غذا کھاتے تھے۔ اسی عنوان سے تاحیات روزہ رکھا۔

اور سماۃ سکینہ وارثیہ اکبرآبادی نے اکیس سال تک دن کو روزہ رکھا۔ اور رات کو سو رکعت نفل پڑھتی تھیں اور اسی حالت میں اس عابدہ کو مالک حقیقی نے دوسرے عالم میں بلا لیا۔

اور حاجی فیضو شاہ صاحب نے چوبیس ۲۴ سال تک بقید ترک حیوانات روزہ رکھا۔ جب خادمِ خاص کے عہدہ پر معمور ہوئے۔ تو بحکم سرکار عالم پناہ قضا کیا۔

اور ابوالحسن شاہ صاحب وارثی متوطن اٹاوہ جب لباس فقر کے خواستگار ہوئے تو حضور قبلۂ عالم نے فرمایا کہ پہلے بارہ سال تک روزہ رکھو۔ موصوف نے حسب الحکم

تامدت مقررہ بکمال احتیاط روزہ رکھا اور اس دوران میں اکثر تیسرے روز بھی انطار کیا۔
اور بابو کنہیا لال صاحب عرف غلام وارث۔ وکیل علی گڑھ۔ عرصہ دراز تک اس
عنوان سے روزہ دار رہے کہ ہمیشہ وکالت کا کام بھی نہایت خوبی سے انجام دیا۔
غرض غلامانِ بارگاہِ وارثی کے اس کثیر التعداد گروہ میں جس طرح حجاج بکثرت ہیں
اسی طرح ایسے روزہ دار بھی متعدد ہیں۔ جو تاحیات دائم الصوم رہے۔ یا جنہوں نے مدت مدید
تک روزہ رکھا۔ اور یہ خصوصیت صرف ہندوستان ہی کے باشندگان کے واسطے موقوف
نہیں ہے۔ بلکہ دیگر ممالک میں بھی اگر تلاش کیا جائے تو حضور قبلۂ عالم کے ایسے حلقہ بگوش
بھی اکثر ملیں گے۔ جنہوں نے خدا کی محبت میں اپنی خواہشات کو فنا کر دیا۔ اور تمام عمر
روزہ دار رہے۔

خصوصاً حجاز و عراق میں جہاں پرستاران وارثی کا شمار کرنا دشوار ہے۔ وہاں تو ایسے
عبادت گذار متعدد گزرے ہیں کہ وہ صائم الدہر اور قائم اللیل تھے۔ کیونکہ اکثر اخوان
ملت نے جو حج و زیارت کے شرف و اختصاص سے فائز تھے۔ بیان کیا ہے کہ دوران
سفر میں سرکار عالم پناہ کے بعض دست گرفتہ ایسے نظر آئے ہیں جو علاوہ دیگر صفات سے
موصوف ہونے کے مستقل روزہ دار بھی تھے۔

چنانچہ حاجی مکی شاہ صاحب وارثی بیان کرتے تھے کہ بیروت میں سنا کہ یہاں سید ابو صالح
محدث شامی ایسے صاحب نسبت بزرگ رہتے ہیں جن کا احترام اس دیار و امصار کے
خاص و عام کرتے ہیں۔ گو بہت عرصہ سے وہ عزلت نشین صائم الدہر ہیں۔ مگر پہلے ہر سال
حج بیت اللہ کے لئے پا پیادہ جاتے تھے۔ اب کبرسنی کی وجہ سے اونٹ پر سفر کرتے ہیں
مگر حدود مکہ معظمہ کے اندر۔ پابرہنہ رہتے ہیں۔

یہ سن کے مجھے بھی ملاقات کا شوق ہوا۔ حتیٰ کہ دوسرے روز۔ وہیں کے ایک تاجر
کے ہمراہ گیا۔ سلام کیا۔ تو موصوف کی پہلی صفت کریمانہ یہ دیکھی کہ کھڑے ہو کر جواب دیا۔

اور معانقہ کیا۔ اور مزاج پرسی کے بعد مستفسر حالات ہوا۔ میں نے دوران گفتگو میں یہ بھی عرض کیا کہ مولانا آپ دائم الصوم کب سے ہیں۔ ممدوح نے ایک آہ سرد بھر کر یہ کہا یا اخی حب سے تمہارے مقتدائے اعظم نے مجھ گنہگار کا ہاتھ پکڑا۔ انہیں کی عنایت سے بہت زمانہ گزر گیا۔ اور انہیں کی امداد و حمایت پر بھروسا ہے کہ بقیہ زندگی اسی حالت میں گزر جائے گی۔ ورنہ "بارِ گراں کجا و من ناتواں کجا"

اور مولوی مظفر حسین صاحب وارثی۔ رئیس امیٹھی۔ وکیل بھوپال ناقل تھے کہ مکۂ معظمہ میں ایک جنازہ کی نماز میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ چونکہ مجمع بہت زیادہ تھا۔ اور اکثر لوگ عقیدتمندانہ صورت سے مضطرب الحال نظر آئے۔ تو میں نے اپنے معلم سے دریافت کیا کہ یہ جنازہ کس بزرگ کا ہے۔ انہوں نے کہا کہ حسن بدوی ان کا نام ہے۔ لیکن صائم الدہر تھے۔ اس وجہ سے شیخ صومی لقب ہو گیا تھا۔ حاجی وارث علی شاہ صاحب کے مرید تھے۔ اور کوہ صفا کے قریب ایک عرشیہ میں رہتے تھے۔ اور ایسی فدایانہ زندگی بسر کی کہ بے طلب جو کچھ آجاتا تھا۔ اسی دن اس کو تقسیم کر دیتے تھے۔ اور اس عمر میں بھی طواف کرنے پاپیادہ آتے تھے۔

غرض ہر دو روایت کا ماحصل یہ ہے کہ بلادِ عرب میں حضور قبلۂ عالم کے وہ ارادتمند جن کی طلب صادق اور خیال پختہ تھا۔ ان میں اکثر دائم الصوم بھی تھے۔ بلکہ مجھے بھی یہ شرف نصیب ہوا ہے کہ اس دیار میں ایسے اہل ریاضت اخوان ملت سے نیاز حاصل ہوا جو ہمارے کامل کے حکم خاص سے دوامی روزہ دار تھے۔ چنانچہ ۱۸۹۲ء کا یہ واقعہ ہے کہ مشہدِ مقدس (خراسان) میں مجھ کو یہ معلوم ہوا کہ آغا عبد العلی اثنا عشری۔ جو پہلے یہاں ناظم توشک خانہ تھے۔ اور اب بوجہ پیری خانہ نشین ہیں۔ وہ سرکار عالم پناہ کے مخصوص حلقہ بگوش ہیں۔ مجھ کو شوق ہوا کہ اُن سے ملاقات ضرور کرنا چاہیئے۔ مگر جامع المتفرقین نے یہ سامان کر دیا کہ اسی روز اور اسی خادم آستانۂ اقدس نے جن سے صبح کو ان کا

ذکر کیا تھا۔ عصر کے بعد یہ خبر دی کہ اس وقت آغا ناظم روضۂ انوار پر حاضر ہوئے ہیں۔ میں فوراً گیا۔ اور موصوف سے ملا۔ اور انہوں نے سلام کا جواب بھی بہ خندہ پیشانی دیا۔ مگر غیر مانوس صورت دیکھی تو چہرہ پر کچھ آثار تحیر نظر آئے۔ میں نے خود اپنا تعارف ان الفاظ میں کیا کہ باوجودیکہ ناآشنا ضرور ہوں۔ مگر اس خصوصیت کی وجہ سے ملنے آیا کہ میں بھی اسی بارگاہِ عالی کا ادنیٰ غلام ہوں۔ جس کے قدیم ارادتمندوں میں آپ کا شمار ہے۔ موصوف نے بکمالِ محبت معانقہ کیا اور نام و نشان سن کے فرمایا کہ یہاں سیری نہ ہوگی۔ اگر تکلیف نہ ہو تو مکان پر چلئے۔ میں نے عذر کیا کہ میری حاضری کا وقت قریب ہے۔ کل حاضر ہوں گا کہا اچھا۔ مگر چائے وہیں پینا ہوگی۔

دوسرے روز میں گیا۔ تو ان کو منتظر پایا۔ بہ شفقت معانقہ کیا اور ایران میں سرکار عالم پناہ کی تشریف آوری کا ذکر کرنے لگے۔ اسی اثنائے میں خادم چائے اور ناشتا لایا۔ ممدوح نے اپنے ہاتھ سے بنا کر ایک فنجان مجھ کو دیا۔ اور خود اسی مذاکرہ میں مصروف رہے یہ دیکھ کر میں نے کہا کہ آپ چائے سے دست کش کیوں ہیں۔ فرمایا۔ معذور ہوں۔ میں نے سبب معذوری پوچھا تو کہا۔ عرض کرتا ہوں۔ وہ سبب یہ ہے کہ دیگر واردات قلبی کے بعد۔ جب داخل سلسلہ ہو چکا تو مجھے چار وقت کھاتے دیکھ کر۔ ایک روز حضور قبلۂ عالم نے فرمایا کہ تم کثیر الغذا کب سے ہو۔ عرض کیا کہ آب و ہوا کے اثر سے یہاں ہر شخص زیادہ کھاتا ہے۔ اور ہضم ہوتا ہے۔ فرمایا۔ شکم سیری سے جس طرح تندرستی میں اضافہ ہوتا ہے اسی طرح طالب خدا کی روحانی ترقی کے واسطے سدِ راہ ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے گرسنگی مفید اور معین الحال ہوتی ہے۔ چنانچہ مشہور مقولہ ہے کہ "اَلْجُوْعُ یُصَفِّی الْفُؤَادَ وَیُمِیْتُ الْھَوَاءَ وَیُوْرِثُ الْعِلْمَ" کہ بھوک قلب کو صاف اور ہوا و حرص کو زائل اور علم کو پیدا کرتی ہے۔

میں نے عرض کیا جو حکم ہو۔ فرمایا کچھ عرصہ تک تم مسلسل روزہ رکھو آئندہ خدا کو

جو منظور ہوگا وہ کرنا۔ مگر گھبرانا نہیں۔

اس روز سے میں روزہ رکھنے لگا تین سال کے بعد جب ایران کو پھر آپ کی تشریف آوری سے عزت حاصل ہوئی تو مجھ کو صائم دیکھ کر فرمایا کہ عبدالعلی۔ روزہ رکھنے سے کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ عرض کیا تکلیف کیسی افطار کے بعد تفریح ہوتی ہے۔ یہ سن کے مجھے قریب بلایا اور شغل سلطان الاذکار تعلیم فرما کر ارشاد ہوا کہ تم دائم الصوم ہو جاؤ۔

اس روز سے دونوں کام کرتا ہوں اور حضور کی عنایت سے۔ آج تک کوئی روزہ بھی نہیں قضا ہوا اور شغل سلطان الاذکار بھی جاری ہے اور اسی ہمت سے روضۂ انور کی اس ممتاز خدمت سے مستغنی ہو گیا ہوں کہ ہمہ وقت انتظام اور انصرام کی مصروفیت میں تفریغ خاطر ہونا دشوار بلکہ محال معلوم ہوا۔

الحاصل روایاتِ مذکورہ سے یہ معلوم ہو گیا کہ حضور قبلۂ عالم کے اکثر حجازی اور عراقی ارادتمند بھی دائم الصوم تھے اور ان کے حالات و واقعات اس کے بھی شاہد ہیں کہ روزہ جو بظاہر بہت آسان اور جسمانی ریاضت کی شکل میں نظر آتا ہے کہ بارہ گھنٹہ کے امساک آب و طعام کو روزہ کہتے ہیں۔ یہ ہماری عدم واقفیت کا اقتضا ہے۔ ورنہ فی الحقیقت اس بے مثل عبادت الٰہی کا زیادہ حصہ روحانیت سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ اصل روزہ روحانی سروکار کا نام ہے۔

عاشقوں کا روزہ چنانچہ روزہ داروں کے۔ ابتدائی مدارج کے قیود و شرائط ہیں جس اہتمام سے اشیائے خورد و نوش کا استعمال ممنوع گردانتے۔ اس سے بہت زیادہ اور مشتق بتاکید وہ احکام ہیں جو روحانی اشغال و احوال کو درست اور شائستہ بناتے ہیں۔ اور جن کی تعمیل و تکمیل کا انحصار۔ روزہ دار کی معنوی دیانت و استعداد پر موقوف ہے۔ یعنی جس طرح ہم ایسے عوام الناس۔ اپنے روزے کے فرائض ظاہری کی نگہداشت کے واسطے منجانب اللہ مکلف ہیں۔ اسی طرح خواص بھی باعتبار مدارج اپنے روزے کو روحانی فروگذاشت

سے محفوظ رکھنے کے لئے قدرتاً مامور ہوتے ہیں۔

اور جب روزہ دار کے مدارج باطنی ترقی پذیر ہوتے ہیں تو ان کے اثرات سے متاثر ہوکر حسیات جسمانی اور کیفیات صوری بھی بتدریج صفات معنوی کے ہم رنگ اور مشابہ ہو جاتے ہیں۔ مثلاً جس حالت اضطراری کو پہلے بھوک اور پیاس کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اُس کیفیت نفسانی کو بھی معیتِ شوق میں جب تجلیاتِ انوارالٰہی کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ جو انسانِ کامل کی حقیقی غذا ہے تو وصال شاہد مطلق کے جوش میں خواہشات معدوم ہو جاتے ہیں اور ماکولات و مشروبات سے وہ بے نیاز ہو جاتی ہے۔

اسی مناسبت سے روزہ دار کے ثبات کامل اور صوم حقیقی کی تعریف میں۔ بلند منزلت ارباب طریقت کے اکثر ارشادات ایسے منقول ہیں۔ جو کلیتہً روحانی ہیں۔ چنانچہ بعض صوفیائے کرام نے ارشاد فرمایا ہے کہ سالکین راہِ حق۔ ماسوائے آب و طعام۔ وسواس و اوہام سے بھی احتیاط فرماتے ہیں۔ بعض اہلِ تفرید کا خیال ہے کہ روزے کے واسطے جمعیت خاطر بھی شرط لازمی ہے۔ ورنہ خطرات خودی۔ اور خدشات دوئی سے حسب ملت عشق کفارہ لازم آتا ہے۔ اور ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ کا قول ہے کہ اہلِ محبت کا روزہ اغراض سے پاک ہوتا ہے۔ اور مخدوم شہاب الدین بن محمد سہروردی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ روزہ دار کو موجودات عالم سے عدم التفات بھی ضروری ہے۔

اسی عنوان سے ہمارے حضور قبلۂ عالم نے روزہ کے منتہائے کمال کو اکثر بصراحت فرمایا ہے۔ مگر ایک مرتبہ نواح بہار میں شیخ محمد اسماعیل صاحب وارثی رئیس پلچھی کے آپ مہمان تھے۔ اور اتفاق سے صفات صوم حقیقی کا ذکر آگیا۔ جس کی تائید میں مولوی عبدالکریم صاحب وارثی نے ارباب لطائف کے وہ اقوال بیان کئے جو روزے کے باطنی رموز و اسرار سے معمور تھے۔ سرکار عالم پناہ نے فرمایا کہ "مولوی صاحب۔ مشربِ عشق میں روزے کی حقیقی صفت یہ ہے کہ ترک غذا کے ساتھ خواہشات غذا کے وسواس

اور لذات غذا کی تمیز و احساس بھی فنا ہو جائے۔

صفاتِ حج — خلاصہ یہ کہ روزے کی تبلیغ میں بھی حضور قبلۂ عالم کی وہی شانِ ہدایت نظر آتی ہے کہ شفقت وارثی نے مریدین کی جسمانی و روحانی حیثیت اور استعداد کا لحاظ اس قدر فرمایا کہ جو مسترشدین مبتدی اور سادہ خیال تھے ان روزہ داروں کے واسطے معروف ارکانِ شرعیہ کی تعمیل کافی متصور فرمائی اور جن کو کم و بیش روحانیت سے بھی تعلق و سروکار تھا ان کو رہنمائے کامل نے انہیں قیودِ معنوی کے ساتھ اس فرضِ قطعی کی بجا آوری کا حکم دیا جس کے وہ اہل اور سزاوار تھے۔

خصوصًا یہ احکام مذکورۂ بالا۔ انہیں اہلِ باطن۔ خدا پرستوں کے حق میں صادر ہوئے جن کے قلوب اثراتِ محبت سے متاثر۔ اور تسلیم و رضائے خداوندی کے لئے آمادہ ہو چکے تھے۔ ورنہ اہلِ ہند کی توانائی اور تندرستی ہرگز اس قابل نہ تھی کہ جس اطمینان اور استقلال سے ایرانی اور افغانی حلقہ بگوش بارگاہ وارثی دائم الصوم رہے۔ اس صبر و ثبات سے ہمارے ہم وطن اخوانِ ملت۔ جو سراپا ضعف و کمزوری کے مجسمہ تھے۔ اس حکم کی تعمیل میں تا حیات تشنہ و گرسنہ رہنا برداشت کر سکتے۔ بلکہ یہ اور زیادہ دشوار معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی کنیزانِ وارثی۔ اگر عنایتِ مرشد شاملِ حال نہ ہوتی تو یہ صنفِ نازک نہ روزہ کے خورد و نوش کو اس طرح فراموش کر سکتیں اور نہ میدانِ صبر میں مردانِ صائم الدہر کے دوش بدوش کھڑے ہونے کی جرأت کرتیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ سرکار عالم پناہ کے فیضانِ باطن سے مستفیض دونوں تھے جس طرح ایرانی اور افغانی صاحبِ حال تھے۔ اسی طرح ہندوستانی حلقہ بگوش اہلِ جوش اور پختہ خیال تھے۔ اور دونوں کو اپنے رہنمائے کامل کے حکمِ ناطق کی بجا آوری بیا با قتضائے روحانیت خاص محویت تھی۔ اسی لئے قوی الجثہ اور ضعیف القویٰ کا فرق و امتیاز نہ رہا اور دونوں اپنی اپنی حیثیت، و اہلیت کے اعتبار سے کامیاب اور فائز المرام ہوئے۔

اسی عنوان سے حضور قبلۂ عالم نے اپنے غلاموں کو کعبۃ اللہ کے شرف و اختصاص سے

آگاہ فرمایا۔ اور چونکہ حج دو نوع پر منقسم ہے۔ حج عام۔ اور حج خاص۔ اس لئے رہنمائے کامل نے ہدایت بھی اسی تفصیل سے فرمائی۔ کہ عام مریدین کو انہیں معروف صفات کعبہ اور برکاتِ حج سے خبردار کیا۔ جو ان کے فہم و خیال کے حسب حال تھا اور خاص مسترشدین کے واسطے مناسک حج کی بجا آوری۔ مشروط بہ ریاضت و مجاہدت گردانی۔ جو شربِ عشق کا عین اصول ہے۔

چنانچہ اکثر آپ نے بطور ترغیب نو آموز ارادتمندوں سے مخاطب ہو کر یہ فرمایا ہے کہ "جس نے صدق و خلوص سے حج کیا۔ اس کا ایمان کامل ہے" اور یہ بھی فرمایا ہے کہ "حج۔ چند امتحانات کا مجموعہ ہے۔ جو اس میں ثابت قدم رہا۔ اس کا خدا کے دوستوں میں شمار ہوا" یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ "جس نے خدا کے بھروسے پر حج کا ارادہ کیا۔ اس کی امداد غیب سے ہوتی ہے"

اور جب کوئی عام مریدین سے حج بیت اللہ کے لئے اجازت طلب ہوتا تھا۔ تو سرکار عالم پناہ فرماتے تھے "جاؤ۔ یہ کام بھی ضروری ہے" اور کسی سے یہ فرمایا "جاؤ۔ اگر محبت ہے تو ہزار کوس پر ہم تمہارے ساتھ ہیں" اور کبھی یہ فرماتے تھے "جو خدا پر بھروسا کرتا ہے۔ خدا اس کی مدد ضرور کرتا ہے" اور کسی سے یہ فرماتے تھے کہ "محبت کا تقاضا یہ ہے کہ مطلوب کی راہ میں اگر تکلیف بھی پیش آئے تو اس کو راحت سمجھے" کسی سے بصورت تاکید یہ حکم ہوتا تھا کہ "طائف بھی جاؤ گے" اور کسی سے مخاطب ہو کر فرماتے تھے کہ "حجاج عمرہ لانے میں بہت کوشش کرتے ہیں" کسی سے یہ فرمایا کہ "میزاب رحمت کا پانی گناہوں کو دھو دیتا ہے۔ اگر بارش ہوتی ہے تو حجاج اس کے نیچے کھڑے ہو کر نہاتے ہیں"

اور جب وہی حلقہ بگوش بعد مراجعت سفر حج حاضر خدمت ہوتے تھے۔ تو اکثر آپ نے اُن سے معانقہ کیا ہے۔ اور وہاں کے حالات متوجہ ہو کر سماعت فرمائے

ہیں۔ اور کبھی کسی سے یہ بھی دریافت کیا ہے کہ "داخلی ہوئی تھی" جس کا عموماً لوگ اقرار کرتے تھے تو آپ متبسم لبوں سے ارشاد فرماتے تھے کہ "بتاؤ۔ کعبہ کے اندر کے ستون ہیں" اور کسی سے یہ فرماتے تھے کہ "بتاؤ۔ وہ ستون کس لکڑی کے ہیں" اور کسی سے بطور مزاح یہ فرماتے تھے۔ "بتاؤ کعبہ کے اندر کیا دیکھا"

اور جو ایسے صاحب حال اور پختہ خیال حلقہ بگوش تھے۔ جن کو نیضان وارثی سے اطاعت رب العزت کا شوق۔ اور محبت شاہد مطلق کا جوش تفویض ہوا تھا۔ وہ حق آگاہ جب حج بیت اللہ کے لئے اجازت خواہ ہوتے تھے تو خود سرکار عالم پناہ ان کو ارض حجاز کی سیاحت کا اشارہ فرماتے تھے تو ان کی حالت وکیفیت کی مناسبت سے ان کو وہی حکم ہوتا تھا جس کے واقعی وہ اہل اور سزاوار تھے۔ مثلاً کسی اہل نیاز دست گرفتہ کو حضور قبلۂ عالم نے خالق مطلق کے اس دربار سالانہ میں پاپیادہ حاضر ہونے کا حکم دیا ہے۔ کسی کو پیشوائے حق نے۔ مناسک حج ادا کرنے کی اجازت بایں شرط مرحمت فرمائی ہے کہ تا اختتام سفر باقاعدہ احرام میں رہنا۔ اور بعض ارادتمندوں کو عرفات کے فیوض و برکات سے بار بار مستفیض ہونے کا حکم ہوا۔ اور بعض اہل تمکین نے اپنے رفیع المرتبت مرشد کے حکم سے مکۂ معظمہ میں مدت العمر قیام کیا۔ اور وہیں کی خاک میں مل کر گناہوں سے پاک ہوئے اور بعض کو حکم ہوا کہ وادی طیبہ کو مستقر بناؤ۔ اور گنبد خضرا پر تجلیات انوارِ الٰہی کا مشاہدہ کرو۔ بعض پختہ خیال زاہدانہ صورت سے۔ عرب کے خشک اور غیر آباد پہاڑوں پر تاحیات عزلت نشین رہے۔ اور بعض منتظر الحال غلاموں کو آقائے نامدار نے اس مقدس دیار کی سیر و سیاحت میں زندگی بھر مصروف رکھا۔

حضور قبلۂ عالم کے یہ مختلف النوعات احکام۔ گو ایک ہی اطاعت خداوندی کے لئے صادر ہوئے۔ لیکن متعدد قیود و شرائط کے ساتھ مسترشدین کو ہدایت ہونے کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مخاطبین کے ذوق و شوق میں کافی تفریق تھی جس کا اقتضا تھا کہ سفر

دیارِ مطلوب کے حقیقی مراحل و منازل طے کرنے میں ان کو جداگانہ طریق اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے سرکار عالم پناہ نے مختلف الخیال ارادتمندوں کو علیحدہ علیحدہ ایک مجاہدہ ایسا تعلیم فرمایا۔ جس کی نوعیت بظاہر شخصی و انفرادی ضرور تھی۔ مگر فی الحقیقت جملہ احکام آپ کے اس خیال سے متحد المعنی تھے کہ مآل ایک تھا۔

اور چونکہ حج بیت اللہ ایسی مخصوص روحانی عبادت ہے۔ جس کے ارکان صوری بھی خصوصیات معنوی سے خالی نہیں۔ اس واسطے ہمارے ہادی برحق نے صفات حج اکثر انہیں الفاظ میں ارشاد فرمائے جن کو باطنی ریاضات اور قلبی مجاہدات سے گہرا تعلق ہے مثلاً آپ نے فرمایا ہے کہ "حاجی وہ ہے۔ جس پر حقیقت حج منکشف ہو جائے" اور یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ "خانہ خدا کی زیارت کا شوق تو سب کو ہے۔ مگر صاحب خانہ کا متلاشی ہزار میں ایک ہوتا ہے" اور یہ بھی فرمایا ہے کہ "کعبہ مقصد زوار ہے۔ اور دل مہبط انوار ہے"

کعبہ بنگاہِ خلیل آزر است   دل گزرگاہ جلیل اکبر است

صفت زکوٰۃ علی ہذا زکوٰۃ۔ جو اسلام کا چوتھا رکن۔ اور بموجب آیہ وافی ہدایہ "وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ" مثل دیگر فرائض کے نہایت مہتم بالشان فرض قطعی ہے۔ مگر باوجود ایسے ممتاز خصوصیات کے بظاہر اس فرمان ایزدی کی بجا آوری بہت آسان معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ عبادت مالی ہے۔ مگر باوجود ایسے ممتاز خصوصیات کے بظاہر اس فرمان ایزدی کی بجا آوری بہت آسان معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ عبادت مالی ہے اور وہ بھی اس قدر نہیں کہ ہر سال اپنے مال کا چھوٹا حصہ مساکین پر تقسیم کر دینے سے یہ فرض ادا ہو جاتا ہے۔

اور فرضیت زکوٰۃ کا سبب بجز اس نظریہ کے اور کوئی نہیں معلوم ہوتا۔ کہ انسان کو اپنا مال اس واسطے زیادہ عزیز ہوتا ہے کہ عیش و آسائش کے جملہ اسباب کی فراہمی خالق موجودات نے مال زر پر موقوف فرمائی ہے۔ پس دنیا کے قیام میں زن کے موہوم آرام کیواسطے مال صرف کرنا۔ یا اس کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ

خدا کی اطاعت میں اپنی مانوس چیز کو ہر سال خنفر کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اس لحاظ سے زکوٰۃ کو امتحان مال کے نام سے تعبیر کرنا۔ ناموزوں نہیں معلوم ہوتا۔

لہذا خالق حقیقی نے بندوں کے اس ناقص اور بے محل اُنس کو رفتہ رفتہ زائل اور معدوم کرنے کے لئے اپنے مکمل اور مستقل قانون میں تمام متبعین اسلام کے حق میں یہ حکم صادر فرمایا کہ " و اٰتوا الزکوٰۃ " کہ تمہارے پس ماندہ سرمایہ پر جب پورا سال گزر جائے تو اس مال کا چالیسواں حصہ خیرات کر دیا کرو۔ جس پر تیرہ سو برس سے بالاتفاق عملدرآمد ہے کہ اپنے اپنے وقت میں علمائے شریعت نے یہی تاکید کی اور یہی ہدایت ارباب طریقت نے اپنے ان طالبین کو فرمائی۔ جن کے دل حقانیت کی جانب مائل ہو رہے تھے

چنانچہ ہمارے سرکار عالم پناہ کے دربار میں جب کبھی فرضیت زکوٰۃ کا ذکر آیا تو اکثر آپ نے عام مریدین سے مخاطب ہو کر فرمایا ہے کہ " بڑا بخیل وہ ہے جو زکوٰۃ نہیں دیتا " اور یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ " جس مال کی صدق دل سے زکوٰۃ دی جاتی ہے۔ خدا اس مال کا محافظ ہو جاتا ہے " اور یہ بھی فرمایا ہے کہ " زکوٰۃ کی فرضیت سے انکار کرنا کفر ہے۔" اور کبھی متبسم لبوں سے یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ " زکوٰۃ بڑے نفع کی تجارت ہے کہ ایک روپیہ کے عوض میں خدا دس روپیہ اور بعض مواقع پر ستر روپیہ دیتا ہے "

لیکن حقیقت زکوٰۃ کو نظر غائر سے دیکھتے ہیں۔ تو ظاہر ہوتا ہے کہ مقربین بارگاہ احدیت کے واسطے یہ مسئلہ بھی اہمیت سے خالی نہیں ہے۔ اور یہ امتحان مال جس کو ہم آسان خیال کرتے ہیں بہت دشوار ہے کہ خدائے جبار نے اس امتحان مال کو۔ اُن جاں گداز ابتلائے خمسہ میں شریک فرمایا ہے۔ جن میں مخصوص اور اولوالعزم عاشقان جانباز۔ آزمائش کے وقت مبتلا کئے جاتے ہیں۔ اور ان کے مراتب خاص کا اختتام اور مدارج علیا کا اتمام انہیں امتحانات کے مصائب اور شدائد کو صبر و شکر سے برداشت کرنے پر موقوف فرمایا ہے۔

ہاں اس قدر تفریق امتیازی ضرور ہے کہ اظہار صفات ابتلائے خمسہ میں خدائے ذوالجلال

نے وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ سے اپنی صولت جبروتی کا اظہار فرمایا ہے کہ ہم تمہاری استقامت صبر و

صداقت ثبات کا خوف میں۔ بھوک میں۔ نقصان مال میں۔ اتلاف جان میں۔ بربادی ثمرات

میں امتحان لیں گے۔

اور مسئلہ زیر بحث میں بجائے "نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ" کے بندہ نوازی کی شان میں

" اٰتُوا الزَّکٰوۃَ " فرمایا کہ ہمیں نے تم کو جو مالی ثروت اپنی عنایت سے مرحمت فرمائی

ہے اس کا ایک قلیل اور مختصر حصہ ہمارے محتاج بندوں کی رفع احتیاج کے واسطے

ہر سال دیا کرو۔

لیکن دیکھتے یہ ہیں کہ جس اہتمام سے احکم الحاکمین نے قرآن پاک میں۔ زکوٰۃ یعنی

انقطاع اُنس مال کا حکم متواتر صادر فرمایا۔ اسی عنوان سے اس کے مقبول خاص۔ اور

مقرب بارگاہ بندوں نے اس فرمان خداوندی کی تعمیل صوری و معنوی کے سامنے ایسا

سر تسلیم خم کیا۔ جو عبدیت کی مجسم تصویر ہے کہ شوق ایثار میں اپنی راحت و عافیت کلیتہً نثار

کر دی۔ کہ زکوٰۃ کے قیود و حدود میں آنا یعنی مال جمع کرنا۔ پھر اس کا ایک حصہ عنداللہ تقسیم

کرنے کے بجائے۔ مال دُنیا سے قطعاً احتراز کیا۔ اور دولت دنیا کو چھونا بھی حرام سمجھا۔

حتیٰ کہ مال و زر کا خیال بھی شرعاً مکروہ اور ممنوع گردانا۔ اور اپنے گنجینۂ صدر کو، زہد کی

گرانقدر دولت اور فقر کے بیش بہا جواہر سے معمور رکھا۔

جس کا ثمرہ شاہد بے نیاز کی سرکار سے یہ ملا۔ کہ بقول مولانا علیہ الرحمۃ " بردہ ویران

خراج و عشر نیست "۔ کہ ان جاں نثاران احدیت کا اس ملک ایثار عافیت کی جہت سے

معافی دار خدمت گزاروں میں شمار ہو گیا۔

چنانچہ ایک عید الفطر کے روز۔ بعض ارادتمندوں کو در دولت پر غلہ لطور فطرہ،

حضور قبلۂ عالم کی جانب سے مساکین پر تقسیم کرتے دیکھ کر ایک معتقد پرستار بارگاہ وارثی

نے ارادہ کیا ہیں کچھ روپیہ زکوٰۃ کے نام سے منجانب سرکار عالم پناہ خیرات کریں۔ جب آپ نے یہ سنا تو اس مخیر غلام سے فرمایا کہ "تم کو معلوم ہے کہ زکوٰۃ صاحب نصاب اس مال یا روپیہ کی دیتا ہے جو سال بھر سے اس کے ملک میں ہو اور جو کسی چیز کا مالک نہ ہو۔ اور جس نے روپیہ کو چھونا حرام سمجھا ہو۔ وہ زکوٰۃ کس چیز کی دے گا"

اسی سلسلہ میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "مشرب عشق میں زکوٰۃ کی تعریف یہ ہے کہ جو چیز حلق سے فرد ہو جائے وہ اپنی تھی اور جو باقی رہے وہ سب زکوٰۃ ہے" اور یہ بھی ارشاد ہوا کہ "بعض مشائخین نے بقدر ضرورت اسباب معیشت اپنے تصرف میں رکھا ہے۔ مگر عشاق کا طریقہ یہ ہے کہ فتوحات کو فوراً تقسیم کر دیتے ہیں تاکہ رات کو وہ خالی ہاتھ ہوں اور کسی چیز کے مالک نہ رہیں"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضور قبلۂ عالم کے ارتفاع احوال و مقامات کا تمثیلاً بھی ذکر کرنا اس لئے ہماری خام خیالی ہے کہ آپ کے زہد اتم اور فقر کامل کے یہی صفات کہ اغراض دنیا سے اعراض کلی اور متاع دنیا سے انقطاع قطعی۔ ایسے غیر معمولی مجاہدات ہیں۔ جن کے مفہوم و مطلب تک ہم لیسے عوام کے دمواس و ادہام کی بھی رسائی۔ ناممکن اور محالات سے ہے۔ بلکہ حضور نے بعض اپنے غلاموں کو ایسے مکمل زہد کی ہدایت فرمائی ہے۔ جس کی مثال پیش کرنا فی الحال مشکل ہے۔

جس کے علاوہ فقرائے خرقہ پوش کے ایک ایسے حلقہ بگوش بارگاہ وارثی کا واقعہ نگارش کرتا ہوں۔ جو بظاہر ایسے گراں بار کے اٹھانے کا کسی طرح سزاوار نہ تھا۔ مگر سرکار عالم پناہ کے تصرفات باطنی کا یہ کرشمہ ہے کہ ایسا ثبات و استقلال تفویض ہوا کہ وہ فرماں بردار باوجود عیال دار ہونے کے مال دنیا سے متنفر اور بیزار ہو گیا۔

چنانچہ ایک مرتبہ حضور قبلۂ عالم منشی تفضل حسین صاحب وارثی وکیل اناؤ کے مہمان تھے عصر کے بعد وکیل صاحب موصوف کے ہمراہ ایک معتقد شخص حاضر خدمت ہوئے

قدمبوسی کے بعد وکیل صاحب نے عرض کیا کہ حضور یہ میرے تو دوست ہیں۔ مگر خدا کے بڑے دیانتدار بندے ہیں کہ باوجود اس خوشحالی کے نہ کھاتے ہیں نہ کھلاتے ہیں۔ خدا کی دی ہوئی دولت کی شب و روز نگرانی کرتے ہیں۔

سرکار عالم پناہ نے اُن سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ تم سود تو نہیں کھاتے۔ اور زکوٰۃ دیتے ہو۔ انہوں نے دست بستہ عرض کیا کہ آپ کی عنایت سے میں سود کو حرام جانتا ہوں اور زکوٰۃ بالالتزام نہیں دیتا ہوں۔ مگر مساکین سے مسلوک ہوتا ہوں۔

ارشاد ہوا کہ شریعت میں انتظام لازمی ہے۔ حساب کرکے زکوٰۃ دیا کرو۔ اور سوتے وقت سو پچاس مرتبہ " لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ " پڑھ لیا کرو۔ وکیل صاحب نے ہنس کر عرض کیا کہ حضور وہ شل صادق آئی کہ نماز بخشوانے گئے تھے۔ روزے گلے پڑے آپ نے فرمایا کہ ہنستے کیا ہو۔ تم بھی تو باقاعدہ زکوٰۃ نہیں دیتے۔ وکیل صاحب نے سرنگوں ہوکر عرض کیا کہ واقعی قصوروار ہوں۔ لیکن آپ دریافت فرمالیں۔ کہ میں عرصہ سے دس میں روز تک کے واسطے بھی چالیس روپیہ کا مالک کامل نہیں ہوا۔

سرکار عالم پناہ نے فرمایا۔ تم ایسے محتاج ہو۔ عرض کیا۔ آپ کے کرم سے محتاج نہیں ہوں آج بھی چار یا پانچسو روپیہ ماہوار کا خرچ ہے۔ لیکن پانچ سال سے کچھ زیادہ عرصہ ہوا کہ اسٹیشن پر آپ نے میرے بے تکے اخراجات دیکھ کر سرسری طور پر فرمایا تھا کہ تفضل۔ کفن کو کبھی کوڑی نہ رکھیں گے۔ جب سے حضور کے اس ارشاد کی تعمیل کرتا ہوں۔ کہ روز کی آمدنی روز صرف ہو جاتی ہے۔ اتفاق سے کبھی روپیہ اگر زیادہ آجاتا ہے تو کچھ دنوں اس کا تحویلدار رہتا ہوں۔ اس لئے زکوٰۃ دینے کی نہ کبھی حیثیت ہوئی۔ اور آپ کا کرم شامل حال ہے تو انشاءاللہ کبھی نہ ہوگی۔

حضور قبلۂ عالم نے فرمایا کہ تفضل اب کسی دن اگر زیادہ بھی روپیہ آجائے۔ تو وہ بھی باقی نہ رہے۔ اُسے بھی صرف کردیا کرو۔ رکھنے سے ہاتھ کالے ہوتے ہیں جس طرح دُنیا

میں خالی ہاتھ آئے تھے اسی طرح خالی ہاتھ رات کو سویا کرو۔ جس کو خدا سے محبت ہوتی ہے وہ مال و دولت سے نفرت کرتا ہے۔"

وکیل صاحب نے قدمبوس ہو کر بکمال ادب عرض کیا کہ آپ نے توفیق مرحمت فرمائی تو آج سے یہی کروں گا۔ لیکن ایک جھگڑا درپیش ہے کہ میرے پاس ہمیشہ سے تین بکس ہیں۔ جن میں روزانہ معینہ رقم ڈالتا ہوں۔ اس کو بھی چھوڑ دوں؟

آپ نے فرمایا۔ وہ کیسے اور کس کام کے واسطے ہیں۔ عرض کیا ایک بکس کا روپیہ ۱۲ ربیع الاول کو خرچ ہوتا ہے اور ایک بکس کا عشرہ محرم میں صرف کیا جاتا ہے۔ اور ایک بکس حضور کی تشریف آوری کے موقع پر کھولا جاتا ہے۔

سرکار عالم پناہ نے فرمایا۔" وہ دونوں بکس تو بدستور رہیں۔ لیکن جو بکس ہماری مہمانداری کے واسطے رکھا ہے اس کو اٹھا دو۔ اگر تم کو روٹی نصیب ہوگی تو کھلانا۔ ورنہ تمہارے ساتھ ہم بھی فاقہ کریں گے۔"

اسی طرح حاجی عباس علی شاہ صاحب وارثی۔ جو حضور قبلۂ عالم کے قدیم تہبند پوش اور بہت خوش اوقات شخص تھے۔ مچھور میں حاضر خدمت ہوئے از منجملہ اور گزارشوں کے یہ بھی عرض کیا کہ گذشتہ جمعہ کو مولوی صاحب نے زکوٰۃ کے ایسے صفات بیان کئے کہ میرے آنسو اس خیال سے نکل آئے کہ اگر میرے پاس روپیہ ہوتا تو میں بھی زکوٰۃ دیتا۔

آپ نے فرمایا کہ تمہاری بسر اوقات کیونکر ہوتی ہے۔ شاہ صاحب نے عرض کیا کہ حسب الحکم پینتے پور کی مسجد میں رہتا ہوں۔ اہل محلہ روٹی دے جاتے ہیں۔ وہی کھا لیتا ہوں۔

ارشاد ہوا کہ روٹی اگر ضرورت سے زیادہ آجاتی ہے۔ تو اس کو کیا کرتے ہو۔ عرض کیا دوسرے روز دن کو کھا لیتا ہوں۔

سرکار عالم پناہ نے فرمایا کہ آج سے اس کی پابندی کرو کہ مغرب تک جو روٹی آئے وہ کھا لیا کرو۔ اور جو بچ جائے یا بعد مغرب کے آئے وہ اسی وقت خیرات کر دیا کرو۔

اسی کو نزکوۃ سمجھو۔

ایک مرتبہ لکھنؤ کے قیام میں۔ حضور قبلۂ عالم کی قدمبوسی کو ایک ایسے غیر معروف تہبند پوش حاضر ہوئے۔ جن کو پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اور آبدیدہ ہو کر عرض کیا کہ میرے حجرہ کا قفل توڑ کر کوئی سب سامان لے گیا۔ ارشاد ہوا تم نے سامان رکھا کیوں۔ آج سے بجز ایک تہبند اور ایک کمبل کے۔ اسباب دنیا میں سے کوئی چیز نہ رکھنا۔ چور کبھی نہ آئے گا۔ اور خادم کو حکم دیا کہ ایک تہبند اور ہمارا کمبل لے آؤ۔ فوراً خادم نے حاضر کیا۔ آپ نے وہ تہبند اور کمبل، شاہ صاحب کو دے کر رخصت کر دیا۔

باہر آکر شاہ صاحب نے وہ تہبند باندھ لیا۔ اور اپنا تہبند کھول کر ایک محتاج کو دیدیا اور ایک گٹھری میں کچھ چیزیں تھیں وہ بھی تقسیم کر دیں۔ صرف سرکار عالم پناہ کا دیا ہوا کمبل لے کر روانہ ہو گئے۔

عقائد مذہبی و اخلاق مشربی

علیٰ ہذا شفقت وارثی نے ہم کو بعض ضروری عقائد مذہبی و اخلاق مشربی سے بھی آگاہ فرمایا ہے۔ چنانچہ علی گڑھ کے اسٹیشن پر ایک طالب راہِ حق نے دست بستہ عرض کیا کہ آپ خضر زمانہ ہیں۔ خدا کے واسطے مجھ کو سبیل نجات بتا دیجیے۔ ارشاد ہوا کہ تم مسلمان ہو۔ تمہاری نجات تو اسی میں ہے کہ صدق دل سے کہو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ کیونکہ یہ صحیح حدیث ہے کہ "مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَقَدْ دَخَلَ الْجَنَّةَ" پس تصدیق سے تو کلمۂ طیبہ کا ورد تم کو جنت کا مستحق کر دے گا۔

ایک مرتبہ پنڈت غلام رسول شاہ صاحب وارثی نے خدمت بابرکت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضور کے فیضان تصرف نے اس گنہگار کو مشرک سے موحّد تو بنا دیا۔ لیکن توحید کی حقیقت سے ہنوز نابلد ہوں۔ تمنا یہ ہے کہ قبلۂ عالم کی زبان مبارک سے توحید کی تعریف بھی سن لوں شاید مجھ نااہل کی سمجھ میں بھی کچھ آجائے۔

سرکار عالم پناہ نے فرمایا۔ کہ پنڈت جی توحید کے ظاہری اور مشہور معنی لغویہ ہیں کہ

خدا کو ایک کہو۔ اور ایک سمجھو۔ جو ایمان کے لئے شرط ہیں: اِنَّمَا اللّٰہُ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ" اور جب اس کی تصدیق ہو جاتی ہے اس وقت توحید کے دوسرے معنی کہ خدا کو ایک دیکھو یہ عارفین کا مقام ہے۔ اس لئے یہ معنی منجانب اللہ موحد کے قلب پر القا ہو جاتے ہیں اور موحد اپنی چشم بصیرت سے ہر چیز میں خدا کا جلوہ دیکھتا ہے۔

پنڈت جی موصوف نے عرض کیا کہ مجھ تازہ مسافر کو اس راہ میں کیا کرنا چاہیئے۔ فرمایا "ایک ذات سے سروکار رکھو۔ اور جو واردات ظاہری۔ یا باطنی پیش آئے اس کا فاعل حقیقی اسی کو سمجھو"۔

ایک مولوی صاحب پنجابی لباس سے آراستہ۔ دلوی شریف میں حاضر خدمت ہوئے اور قدمبوس ہو کر عرض کیا کہ یہ ناچیز ضلع راولپنڈی کا باشندہ ہے۔ تین سال سے یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ ہمارے واحد اور لاشریک خدا کے وہ صفات اور خصوصیات کیا ہیں جو اس کی شان الوہیت کے برہان قطعی ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ منجملہ دیگر خصائص کے۔ اس کی ایک مخصوص صفت یہ ہے کہ ذات حضرت احدیت تغیرات سے پاک ہے۔ جو خالق مطلق ہونے کی عین دلیل ہے اور مخلوق کے حالات میں تغیر اور تبدل ہونا لازمات سے ہے"۔

ایک روز حضور قبلۂ عالم کی خدمت بابرکت میں چند علم دوست ارادتمند حاضر تھے۔ اور محدثین عظام اور فقہائے اسلام کی ان گرانقدر خدمتوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ جو انہوں نے دین متین کی حمایت اور اشاعت میں مدت العمر کی ہیں۔

اسی دوران میں ایک حاضر باش غلام نے سرکار عالم پناہ کا تخاطب پا کر بکمال ادب عرض کیا کہ واقعی علمائے سلف کے ہم سراپا مرہون منت ہیں اور اُن کی بے غرض خدمات کا بھی پورا اعتراف ہے جن کی وجہ سے آج دفتر اسلام ایسا مکمل نظر آتا ہے جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

لیکن اُن باکمال ہستیوں کے افراطِ علم و فضل کا تحقیق کے میدان میں متواتر مقابلہ ہونے سے نتیجہ برعکس ہوا۔ کہ اس باہمی اختلاف نے تقریب قریب ہر مسئلہ کو اس قدر دقیق اور پیچیدہ کر دیا جس کی بجز ناقد بصیر کے۔ عام مسلمان۔ بلکہ متوسط العلم اہلِ اسلام بھی وسیع النظر نہ ہونے کے باعث چونکہ اس عالمانہ بحث کی صحیح تنقید نہیں کر سکتے۔ اس لیے بجائے تحقیق کرنے کے ایک فریق کی تقلید پر مجبور ہوتے ہیں۔

چنانچہ عرصہ سے یہ غلام اس کا منتظر تھا کہ جناب کی توجہ سبز دل دیکھوں تو بہ خیال استفادہ یہ عرض کروں کہ از روئے حقیقت اصحاب کبار۔ اور اہل بیت اطہار کی عظمت و منزلت میں کیا تفریق ہے۔ اور بحیثیت ان کے فضل و کمال کے ہم کو کیا عقیدہ ان کی نسبت رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ علمائے کرام کے مختلف اقوال جن کی حیثیت بجائے علمی مکالمہ کے مناظرانہ بلکہ مجادلانہ شان ہو گئی ہے۔ اس لیے وہ تشفی بخش نہیں رہے۔ اور تصفیہ طلب ہو گئے۔

ارشاد ہوا کہ علماء کا یہ اختلاف بحیثیت نفسانیت نہیں۔ بلکہ بہ لحاظ حقانیت ہے کیونکہ دونوں خاصانِ بارگاہِ ایزدی کے صفات و خصوصیات میں افراط اور بہتات اس قدر ہے کہ مبصرین و محققین کی نظر خیرہ اور منتشر ہو جاتی ہے۔" مگر اہلِ حق کا مذہب یہ ہے کہ بہ اعتبار اخبار و آثار اصحاب رسول کریم کی تعظیم واجب اور لازمی ہے۔ اور اہلبیت اطہار کی محبت نص قطعی سے فرض ہے۔"

ایک مرتبہ حضور قبلۂ عالم دیوٰی شریف میں قیام فرما تھے کہ منشی نادر حسین صاحب وارثی بگرامی حاضر خدمت ہوئے اور بیان کیا کہ کل ایک وکیل صاحب سے گفتگو ہوئی تو میں نے جنگ صفین کے بعض واقعات کے حوالہ سے امیر شام کا مورد الزام ہونا ثابت کر دیا۔ اور آخر میں ان کو بھی خطائے منکر کا اقرار کرنا پڑا۔

سرکار عالم پناہ نے فرمایا۔ نادر حسین۔ واقعات جنگ صفین کو مورخین نے صحیح

نہ دیہ مانا ہے۔ مگر فرض کرو کہ ایک مکان میں چند اشخاص۔ ہم وطن یا ہمعصر یا ہم جد ہونے کی وجہ سے باہم رہتے ہیں اور ان میں سے ایک شخص نے کتا پالا۔ اور اس کی داشت اور پرورش وہی پالنے والا کرتا ہے۔ تو جس طرح یہ قاعدہ ہے کہ وہ کتا دم۔ اپنے پالنے والے ہی کے سامنے ہلائے گا۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اس مکان کے کسی رہنے والے کو وہ کتا کاٹے گا بھی نہیں۔

اس اعتبار سے تم بہ حیثیت ایک وفادار غلام ہونے کے۔ اپنے آقائے نامدار کی ثنا وصفت میں معروف رہ سکتے ہو۔ مگر اپنے مالک کے ساکنین کو اگر باہم شیر و شکر نہیں بھی دیکھتے ہو تو بھی سنت مرتضوی یہ ہے کہ اچھا نہ جانو تو برا بھی نہ کہو۔

اور کلیہ تو یہ ہے کہ جس دل کو محبت سے سروکار ہوتا ہے اس میں عداوت کی گنجائش نہیں رہتی۔ بقول

شدہ است سینۂ ظہوری پر از محبت یار برائے کینۂ اغیار در دلم جا نیست

بلکہ محبت کامل کی تعریف تو یہ ہے کہ محب کو بجز تصور یار کے اغیار کا خیال کبھی نہ آئے۔ چنانچہ جو سمجھدار ہیں وہ ماسوائے صفات یار۔ ما و شما کے حرکات و سکنات کا ذکر بھی نہیں کرتے۔ بقول

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

ایک مرتبہ حضور قبلۂ عالم کے دربار میں سلاسل ارباب طریقت کا ذکر آیا۔ اور حاضرین میں سے ایک صاحب نے ان کے بعض فروعی مسائل پر نکتہ چینی کا ارادہ کیا۔ سرکار عالم پناہ نے فرمایا کہ منزل شاہد حقیقی تک پہنچنے کے لئے گو راہیں جداگانہ ضرور ہیں۔ مگر فی الحقیقت راہ گیروں کا مقصود اور نصب العین ایک یعنی لقائے یار ہے۔ اس واسطے رہ منزل کے نشیب و فراز کا تذکرہ بیکار ہے۔

حضور قبلۂ عالم کے ایک ارادتمند نے بہ سبیل تذکرہ اپنا یہ واقعہ بیان کیا کہ میں

اپنی ذاتی ضرورت سے دو ہفتہ اجمیر شریف میں رہا۔ مگر جس کام کے لئے گیا تھا۔ وہ کام بھی نہیں ہوا اور مزید برآں ہوٹل سے کپڑوں کا بکس بھی جاتا رہا۔

سرکار عالم پناہ نے فرمایا کہ دوران قیام میں خواجہ صاحب کے سلام کو بھی گئے تھے اس نے عرض کیا کہ ایسے افکار میں مبتلا تھا کہ درگاہ تک جانے کی نوبت نہ آئی۔ ارشاد ہوا کہ اسی بے ادبی کی یہ سزا تھی۔ جو بکس چوری ہو گیا۔ "طریقت کا ادب یہ ہے کہ جس شہر میں ایک شب بھی قیام ہو۔ وہاں کے مشہور اہل اللہ کے مزار پر ضرور جائیے۔"

ایک سن رسیدہ مولوی صاحب حضور قبلہ عالم کی ملاقات کو دیوی شریف میں حاضر ہوئے۔ آپ نے باقتضائے خلقِ عمیم معانقہ کیا۔ اور تھوڑے عرصہ تک گفتگو فرما کر تعظیم کے ساتھ ان کو رخصت کر دیا۔ جب وہ چلے گئے۔ تو حاضرین میں سے ایک نے دوسرے سے کہا کہ میں ان کو خوب جانتا ہوں۔ یہ مولوی صاحب بڑے مکار ہیں۔ کہتے ہیں کہ میرے قبضہ میں ایک جن ہے۔

سرکار عالم پناہ نے فرمایا کہ کیوں اپنی زبان اور اپنے دل کو دوسرے کے واسطے خراب کرتے ہو۔ معمولی عیوب تو بیان کر دیئے۔ مگر وہ ہنر جو بدیہات سے ہیں۔ ان کو نظر انداز کر دیا۔ کہ مولوی صاحب کی شریفانہ تہذیب۔ مقدس صورت۔ نورانی ریش مشروع لباس کی قدر نہ کی۔ جس کو اسلام کے ملند پایہ پیشواؤں کی وضع سے خاص مناسبت اور مشابہت ہے۔ حالانکہ دل کی بدنما خرابیوں کو۔ بزرگوں کی وضع کے پردہ میں چھپانا مستحسن فعل نہیں ہے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس بندہ نواز کی عنایت سے اچھوں کی نقل کرنے میں علاوہ دنیوی منفعت کے دین کے بگڑے ہوئے کام بھی بن جاتے ہیں۔

چنانچہ مشہور ہے کہ ایک مسخرہ فرعون کو خوش کرنے کے واسطے موسیٰ علیہ السلام

سی نقل کرتا تھا کہ اسی وضع کا لباس پہن کر۔ اور اسی صورت کا عصا لے کر۔ روزانہ دربار میں آتا۔ اور اسی لہجہ میں وعظ کہتا تھا۔ جو کلیم اللہ کا طرز کلام تھا۔

مگر جس روز وہ بہروپیا مر گیا تو خدائے برتر نے اپنے اس مقرب فقیر کو۔ جو عرصۂ دراز سے ایک پہاڑ پر تجلیات انوار الٰہی کی دید کے لئے عزلت نشین تھا۔ حکم دیا کہ "فلاں محلہ میں ہمارا ایک دوست مر گیا ہے۔ جاؤ اس کی تجہیز و تکفین میں شریک ہو۔"

وہ خدا کا برگزیدہ بندہ فوراً اس محلہ میں گیا۔ اور دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ فرعون کا مسخرہ مر گیا ہے۔ مگر چونکہ حکم الٰہی کی تعمیل لازم تھی۔ اس کی تجہیز تکفین میں شریک ہو کر واپس آیا۔ تو بارگاہِ ایزدی میں عرض کیا کہ الٰہ العالمین۔ وہ مسخرہ تو بظاہر بد مذہب اور فرعون کا پرستار تھا۔ تو نے اسکو کس عمل کی جہت سے اپنے دوستوں میں شمار فرمایا۔

آواز آئی کہ بلاشبہ وہ ہمہ تن فسق و فجور میں مبتلا ضرور رہتا تھا۔ لیکن لباس موسوی کی نقل کرتا تھا۔ اس لئے ہم نے اپنے کلیم کے لباس کا احترام کیا اور اس نقال کو اپنے مقربین میں داخل کر لیا۔

ایک شخص نے حضور قبلۂ عالم کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ عرض کیا کہ میرا ارادہ ہے کہ اپنے پیر کی بیعت کو توڑ دوں اور آپ کا مرید ہو جاؤں۔ ارشاد ہوا کہ انہوں نے کیا تصور کیا کہ ہی بنائی بیعت کو توڑنے پر آمادہ ہو۔ اس نے عرض کیا کہ بڑا تصور یہ ہے کہ وہ بے فیض ہیں فرمایا کہ "تصور ان کا نہیں ہے فیض حاصل کرنا تو تمہارا کام ہے۔ جاؤ اور محبت کے ساتھ انہیں سے رجوع کرو۔ جو تمہاری قسمت کا ہے وہ انہیں کے ذریعہ سے تم کو ضرور ملے گا۔ گھبراؤ نہیں۔"

ایک شخص نے خدمت والا میں عرض کیا کہ مجھکو مرید کر لیجئے۔ آپ نے بے ساختہ فرمایا۔ تم کسی کے مرید نہیں ہو۔ اس نے عرض کیا کہ مرید تو میاں محمد شیر صاحب کا ہو چکا ہوں۔ مگر میری خواہش ہے کہ آپ کا بھی مرید ہو جاؤں۔ ارشاد ہوا کہ جس طرح ایک عورت کو دو مردوں سے

بیک وقت نکاح کرنا ممنوع ہے۔ اسی طرح ایک مرید کو دو پیروں کے ہاتھ پر بیعت کرنے میں نقصان ہے۔

دیکھو ایک ناؤ پر سوار ہونے میں۔ سلامتی سے پار اُتر جانے کی زیادہ امید ہے اور برخلاف اس کے اگر کوئی شخص ایک پاؤں۔ ایک ناؤ پر۔ اور دوسرا پاؤں دوسری ناؤ پر رکھ کر دریا سے پار ہونا چاہے تو ڈوبنے کا خوف ہے۔ بس جاؤ۔ اگر طلب صادق ہوگی تو جس کا ہاتھ پکڑا ہے یہی صورت میں تم کو خدا ملے گا۔

حضور قبلۂ عالم کے ایک قدیم اور معمر ارادتمند۔ جو مشرب وارثی کے مذاق و مسلک سے بقدر حیثیت واقف بھی تھے۔ وہ حق شناس ترکِ لباس آبائی کے خواستگار ہوئے اور جناب حضرت نے اپنا ملبوس خاص مرحمت بھی فرمایا۔ اب قریب تھا کہ کسی ریاضت کی بھی ان کو ہدایت ہو کہ فوراً ایک مزاج داں خادم نے دست بستہ عرض کیا کہ ہمارا ایمان ہے کہ ہر حال میں آپ اُن کے حامی اور نگہبان رہیں گے لیکن بظاہر ان کی عمر کی رعایت سے ان کو آسان ذکر یا شغل تعلیم فرمایا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ ایسی ریاضت شاقہ کی ہدایت کی جائے کہ یہ ضعیف القویٰ۔ بڑے میاں فنا فی المجاہدہ ہو جائیں۔

سرکار عالم پناہ نے فرمایا آپ کی سفارش منظور۔ ہم ان کو ایسا شغل بتاتے ہیں کہ بالکل تکلیف نہ ہوگی۔ شیخ جی تم صدق کو اپنا توشہ بناؤ۔ اور جو کام کرو۔ اس کی نیت اللہ کے واسطے ہو۔ اگر کھانا کھاؤ تو نیت کرو کہ میں اللہ کے واسطے کھاتا ہوں اور نہ کھاؤ تو بھی یہی خیال کرو کہ میں اللہ کے واسطے نہیں کھاتا ہوں۔ غرض سونا۔ جاگنا۔ اٹھنا۔ بیٹھنا۔ تمہارا اللہ کے واسطے ہو۔ اور ماسوائے اللہ سے بے غرض رہو۔ جیسا کہ سفیان ثوری کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ نماز صبح کے لیے۔ تاریکی کی وجہ سے۔ انہوں نے قمیص الٹا پہن لیا۔ اور خبر نہ ہوئی۔ اشراق کے وقت لوگوں نے آگاہ کیا۔ سفیان نے ارادہ کیا کہ اس کو اتار کر سیدھا رخ بدل کے پہن لوں۔ مگر پھر ہاتھ روک لیا۔ اور کہا کہ اس کو میں نے اللہ کی نیت سے پہنا تھا۔ اب

یہ گوارا نہیں کرسکتا کہ اس کا رخ بدل کر بغیت الناس بینوں۔

ایک مرتبہ حضور قبلۂ عالم نے کسی قدر جلال آمیز لہجہ میں فرمایا کہ اہل محبت کے بعض اقوال کو جو درحقیقت ان کے احوال کے ترجمان ہوتے ہیں قابلِ الزام خیال کرنا۔ لوگوں کی بدگمانی اور صریح نادانی ہے۔ بقول مولانا

گفتگوئے عاشقاں در کار رب   جوشش عشق است نے ترک ادب

ایک مرتبہ حضور قبلۂ عالم نے فرمایا کہ اکثر فقرائے اہل تمکین کے بھی عادات بحیث واردات قلبی متغیر ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی ادب ان کا مستقل رہتا ہے۔ بلکہ جس قدر ان کے مدارج مرتفع ہوتے ہیں اسی قدر زیادہ مؤدب ہوتے ہیں اور جو معروف آداب ہیں ان میں ضرور سنت رسالت کی وہ تقلید کرتے ہیں، اور اگر سہواً کبھی تقصیر ہوتی ہے تو ارباب طریقت ان کو بہ نظر تحقیر دیکھتے ہیں۔ چنانچہ منقول ہے کہ بایزید بسطامی (علیہ الرحمۃ) کو معلوم ہوا کہ ایک فقیر کو اس کے کی وجہ سے اہل دیار و امصار کے لوگ ولی سمجھتے ہیں۔ آپ کو بھی اس فقیر کی ملاقات کا شوق ہوا۔ اور ایک بار کو ہمراہ لے کر اس کو دیکھنے گئے۔ جبکہ اس قریہ میں پہنچے تو دیکھا کہ وہ فقیر اپنے مکان سے نکل کر مسجد کی طرف جا رہا ہے۔ راستہ میں اس نے تھوک پھینکا۔ اور اتفاق سے وہ سمت قبلہ تھی۔ یہ دیکھ کر بایزیدؒ نے اپنے یار سے کہا واپس چلو۔ وہ انکا لیکن یہ شخص سنت رسول اللہ کا امین اور معتمد نہیں ہے تو یہ صفات اولیا اور مقاماتِ اصفیا کا مستحق اور سزاوار کیونکر ہو سکتا ہے۔

ایک مرتبہ حضور قبلۂ عالم نے بدوران سیاحت بہار۔ صرف آرام کے خیال سے ایک شب کے لئے جونپور میں قیام فرمایا۔ بعد مغرب مولانا عبدالرحیم صاحب جو اپنی فلسفہ دانی کے باعث عوام میں دہریہ مشہور رہتے۔ مع اپنے شاگرد رشید مولوی ریاض الحسن صاحب جناب حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

اثنائے گفتگو میں یہ عرض کیا کہ حسب روایات مذہبی یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ابلیس

نے غیر خدا کے سجدہ سے انکار کیا تو قابل لحاظ یہ امر ہے کہ وہ اپنے اس مستحسن عمل کی وجہ سے ایسا قصوروار کیوں گردانا گیا کہ بجائے موحد کے اس کو شیطان اور ملعون کہتے ہیں۔

سرکار عالم پناہ نے ارشاد فرمایا کہ مولوی صاحب موحدین تو شیطان و رحمٰن میں فرق نہیں کرتے اور عشاق شیطان کو برا نہیں کہتے۔ بلکہ واقعہ ابلیس خاص قسم کا سبق ہے لیکن شریعت کی رُو سے ابلیس نے یہ غلطی کی کہ آدم کو غیر سمجھا اور "خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰے صُوْرَتِہٖ" کا خیال نہ کیا۔

مولانا موصوف یہ تفصیلی جواب سن کے خاموش بلکہ میکیف ہو گئے۔ اور آبدیدہ ہو کر جناب حضرت کی عظمت و منزلت کا صاف لفظوں میں اقرار کیا۔

ایک مرتبہ حضور قبلۂ عالم نے فرمایا کہ مرید کے واسطے بہت زیادہ مفید یہ ہے کہ جب صبح کو اٹھے تو ارادہ کرے کہ میں گناہ نہ کروں گا۔ اور جب شام ہو جائے تو قصد کرے کہ گناہ نہ کروں گا۔ یہ روزانہ کا ارادہ رفتہ رفتہ مستقل بھی ہو جاتا ہے۔

ایک مرتبہ حضور قبلۂ عالم نے فرمایا کہ دنیا میں قابلِ تعریف وہ شخص ہے جس کے دل میں کسی کی طرف سے بغض اور کینہ نہ ہو جو رسول اللہ صلعم کی خاص سنت ہے۔

ایک مرتبہ حضور قبلۂ عالم نے بعض ارادتمندوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ بغض و عناد کی اصل دنیا کی رفعت و منزلت کی محبت ہے۔ اس لئے غبار نفاق سے اسی کا دل صاف ہوتا ہے جس کی نگاہ میں دنیا کے مال و جاہ کی قدر و عزت نہ ہو۔

ایک تعلیم یافتہ ارادتمند نے حضور قبلۂ عالم کی خدمت بابرکت میں عرض کیا کہ بغض و نفاق کا سدباب کیونکر ہو۔ ارشاد ہوا کہ جو دل اسباب دنیا سے غیر مالوف اور خدا کے ذکر میں مصروف رہتا ہے وہ دل بغض و نفاق کے اثرات سے متاثر نہیں ہوتا۔

ایک مرتبہ حکیم سید عبدالاحد شاہ صاحب نے عرض کیا کہ طالبِ راہ کے صدق و خلوص کی شناخت کیا ہے۔ ارشاد ہوا کہ جس کا دل خدا کے ذکر سے شگفتہ اور دنیا

کے ذکر سے افسردہ ہو تم سمجھ لو کہ اس کا خیال پختہ ہے۔

ایک تعلیم یافتہ حلقہ بگوش نے حضور قبلۂ عالم کی خدمت والا میں عرض کیا کہ تواضع کا پہلا سبق کیا ہے۔ اور کس طرح ایک مبتدی کی طبیعت متواضع ہو سکتی ہے۔ ارشاد ہوا کہ جس کو دیکھو خیال کرو کہ یہ مجھ سے بہتر اور افضل ہے۔

ایک مرتبہ قیام بانکی پور میں حضور قبلۂ عالم مثنوی شریف کا مطالعہ فرما رہے تھے جب خصوصیات ادب کا ذکر آیا۔ تو بیساختہ فرمایا کہ منجملہ دیگر صفات کے جو آداب صوفیہ سے مؤدب ہوتا ہے۔ اس کا ایک خاصہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وعدہ کرتا ہے۔ تو یاد رکھتا ہے۔ اور احسان کرتا ہے۔ تو بھول جاتا ہے۔

ایک مرتبہ حضور قبلۂ عالم نے فرمایا کہ صدق ایسی صفت مستحسنہ ہے کہ جملہ صفات حمیدہ کی اصل صدق مقال ہے۔ اور کذب ایسا مذموم فعل ہے کہ تمامی اخلاق ذمیمہ کی جڑ دروغ گوئی ہے۔ بقول مولانا۔

صدق بیداری کہ ہر حس می شود — حسہا را ذوق مونس می شود

دل نیارامد ز گفتار دروغ — آب روغن ہیچ نفروزد فروغ

ایام میلہ کاتک میں بارگاہ وارثی کے ایک قدیم اور ایسے متوکل تہبند پوش فقیر حاضر خدمت ہوئے۔ جن کو اخوان ملت زاہد اور ابرار کہتے تھے۔ تھوڑے تامل کے بعد حضور قبلۂ عالم نے ان سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا کہ تم کو معلوم ہے زاہد کس کو کہتے ہیں انھوں نے دست بستہ عرض کیا۔ کہ حضور بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ دو چار فاقوں کے بعد نمک کے ساتھ روٹی کھانے کا نام زہد نہیں ہے۔ بلکہ زاہد وہ ہے جو دنیا سے پرہیز کرے۔ خواہشات کو رد کرے۔ مرادوں کو بھول جائے۔ گرسنگی اور سیر شکمی کے اثرات سے یکساں متاثر ہو۔ کوئی چیز پاس نہ ہونے کے وقت مطمئن رہے۔ اور جب کوئی چیز آجائے۔ تو اس کو راہ خدا میں تقسیم کرنے کے واسطے دل

مضطرب ہو۔

چنانچہ بایزید بسطامی کا قول ہے کہ بلخ کے ایک فقیر نے مجھ سے پوچھا کہ زہد کی تعریف کیا ہے۔ میں نے کہا۔ ملا تو کھا لیا۔ نہ ملا۔ تو صبر کیا۔ اس نے کہا یہ صفت تو ہر کتے میں پائی جاتی ہے۔ میں نے کہا۔ تم بتاؤ۔ اُس نے کہا۔ نہ ملا تو شکر کیا۔ ملا۔ تو خرچ کر ڈالا۔

ایک مرتبہ حضور قبلۂ عالم نے فرمایا کہ باخبر فقیر وہ ہے۔ جس کے پس پُشت دُنیا ہو اور خوف خدا اس کے سامنے رہے۔

ایک مرتبہ حضور قبلۂ عالم نے فرمایا کہ جس فقیر کا خلق سے سروکار رہا۔ وہ خراب ہوا۔ اور جس نے حق پر بھروسا کیا وہ کامیاب ہوا۔

ایک مرتبہ مولانا ہدایت اللہ صاحب وارثی محدث سورتی۔ دیوئی شریف میں حاضر ہوئے اور بعض دیگر تحائف کے ساتھ ایک ضخیم کتاب بخط ولایت ادر متالآ۔ فارسی میں موسوم بہ اسرارِ عشق۔ مصنفہ قاضی محمود صوفی بن علی الکاشانی۔ جس پر کتب خانہ تیموریہ کی مُہر ثبت تھی۔ پیش کی۔

حضور قبلۂ عالم نے اس کتاب کے بعض ابواب۔ سرسری نظر سے ملاحظہ فرما کر مولانا موصوف کو دیدی اور ارشاد ہوا کہ نایاب نسخہ ہے۔ تم اس کو بہ احتیاط محفوظ رکھو گے ہمارے پاس ہوگی تو ہم کسی کو دیدیں گے۔

مولانا ممدوح نے عرض کیا کہ میں نے اس کتاب کا بالالتزام بلکہ مکرر مطالعہ کیا۔ اس میں شک نہیں کہ مصنف نے ہر مسئلہ کی صراحت میں کافی کوشش وکاوش فرمائی ہے۔ مگر اکی توجہ نہیں کی کہ عاشقانِ جمالِ ایزدی کے مذاق ومسلک میں اس قدر تضاد کیوں ہے۔

سرکار عالم پناہ نے فرمایا کہ مولوی صاحب اس کا سبب یہ ہے کہ ہر آن تجلیات انوار شاہد حقیقی کی شان جداگانہ ہوتی ہے۔ "کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِی شَاْنٍ" جن کے اثرات بھی

فنات المفاد ہوتے ہیں۔ پس جس صورت میں ارباب بصیرت کو دید ہوتی ہے۔ اسی مناسبت سے ان کا طرز طریق اپنی نوعیت میں یگانہ ہوتا ہے۔

اس کے بعد حضور قبلۂ عالم نے صفاتِ عشق کی ماہیت اور درجاتِ عاشقین کی حقیقت کا مگر تمثیلات کے پیرایہ میں دوسرے عنوان سے جس تشریح سے ذکر فرمایا۔ اس عارفانہ تقریر کا مضمون یہ تھا۔

علاوہ اس کے یہ بھی منقول ہے کہ عاشقان جانباز نے عالمِ ارواح میں بروزِ عہدِ الست شرابِ سلسبیل عشق کا تشرب مختلف عنوان سے فرمایا۔ اسی سبب سے جرعہ کشانِ بادۂ محبت کی وارداتِ قلبی میں یہ اختلاف ہے کہ حالت و کیفیت میں بھی بدیہیات سے تفریق ہے اور مذاق و مشرب میں بھی کافی تفرقہ نظر آنے لگا۔

مثلاً بعض عشاق نے بروزِ میثاق۔ بادۂ عشق و محبت۔ شوق اور اشتیاق کے جام میں۔ بمصداق "اَلشَّوْقُ ثَمَرَةُ الْمَحَبَّةِ مَنْ اَحَبَّ اللّٰهَ اشْتَاقَ اِلٰی لِقَائِهٖ" نوش فرمایا۔ بعض اسیرانِ دامِ محبت نے ساغر حزن و اندوہ کو اس خیال سے پسند کیا کہ "فَلْيَضْحَكُوا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا" فرمان حضرت ذوالجلال ہے۔ بعض نے شراب عشق پینے کے واسطے قلق و اضطراب کا پیالہ انتخاب کیا۔ بعض نے شاہد مطلق کی صولت و جلالت کے رعب سے لرزاں و ترساں ہو کر شراب محبت کو کاسۂ خوف میں پینا بفحوائے "فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ" مناسب جانا۔ بعض نے "لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ" کی بشارت سن کر زلالِ عشق کو جامِ رجا میں پی لیا۔ بعض نے ساغر درد میں عشق کی شراب کو پینا اس وجہ سے بہتر سمجھا کہ درد کو عشاق پسند کرتے ہیں۔ بقول

شرابِ عشق می نوشم زہجرت   نباشد ہیچ خوشتر زیں شرابے

غرض خمخانۂ ازل میں۔ ساقی عہد الست کے روبرو جس نے زلالِ عشق کو جس صفت کے پیالے میں استعمال کیا۔ وہی اثر عالمِ امکان میں اس کے طریق کا رفیق صادق ہوا۔

ایک مرتبہ حضور قبلۂ عالم نے فرمایا کہ اور عبادتیں تو ایسی ہوتی ہیں کہ جو بندہ کرتا ہے۔ اور اجر اس کا خداوند کریم مرحمت فرماتا ہے مگر محبت ایسی عبادت ہے کہ جب خدا سے ہم محبت کرتے ہیں۔ تو بجائے جزا دینے کے خدا ہم سے محبت کرتا ہے۔ بقول

يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ چہ گفتار است　　　یہ زیر پردہ مگر خویش را خریدار است

اسی سلسلہ میں حضور قبلہ عالم نے یہ بھی فرمایا کہ بندہ کی محبت سے خدا کی محبت مقدم ہے۔ اسلئے کہ بندہ کی محبت کی تعریف یہ ہے کہ ذات حضرت واجب الوجود کے ساتھ قلب کو اشتغال ہو اور چونکہ قلب اور اشتغال قلب سے وہ ذات اقدس پاک اور منزہ ہے۔ لہذا اس کی محبت کی تعریف یہ ہے کہ بندہ کو جذب الٰہی اپنی جناب میں کھینچے اور غیر کی جانب متوجہ ہونے سے باز رکھ سکے۔ پس محبت بندہ فرع ہے۔ محبت خدا کی۔ کیونکہ جب اللہ تبارک و تعالیٰ بندہ کو اپنی جانب رجوع کرتا ہے۔ تب بندہ کو خدا کی محبت ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ حضور قبلۂ عالم نے فرمایا کہ معشوق سے بھی سوال کرنا مسلک عشق منافی ہے۔ لیکن درانحالیکہ صدمات ہجر اور اندوہ فراق سے مضطرب و بے قرار ہو کر اگر کوئی عاشق زار۔ طلب محبوب کے لئے محبوب ہی سے سوال کرے۔ تو اکثر عشاق نے اس کو بھی بایں شرط مباح یا مکروہ تنزیہی گردانا ہے کہ مقصود سوا اس کے اور کچھ نہ ہو کہ معشوق ہم کو مل جائے۔ یا ہم معشوق کے ہو جائیں۔

اسی کے ساتھ یہ فرمایا ہے کہ مدارج عشاق کے لحاظ سے سوال فی المطلوب کے بھی چند مراتب ہیں۔ اور ہر مرتبہ کے سائلین کا طرز استدعا اور طریق سوال جداگانہ ہے۔ چنانچہ بعض عشاق زبان ظاہری اور عبارت معروف ہیں۔ طلب معشوق کے لئے۔ معشوق ہی سے۔ خلوت میں بھی جلوت میں بھی سوال کرتے ہیں۔ اور بعض بلند حوصلہ اور رفیع المرتبت عشاق کی عرضداشت بہ رجوع قلب اور زبان مستور سے ہوتی ہے اور بعض عشاق سمجھتے ہیں کہ ہماری حالت ہی صورت سوال ہے۔ اس لئے وہ

صادق الیقین نثار محبوب کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہیں کو سوال من المطلوب خیال کرتے ہیں اور ہر حال میں راضی برضائے محبوب رہتے ہیں اور بعض عشاق چاہتے ہیں کہ معشوق جسم کو مل جائے یعنی صفات معشوق کے ہم عارف ہو جائیں۔ اور بعض عاشقان صادق کی استدعا یہ ہوتی ہے کہ ہم معشوق کے ہو جائیں کہ ہماری ہستی شاہد حقیقی کے سامنے نیست و نابود ہو جائے۔ جسکو اصطلاح صوفیہ میں فنائے اتم کہتے ہیں۔

لیکن سوال کسی عنوان سے کیوں نہ ہو۔ مگر چونکہ سراپا بوئے طلب سے معمور ہوتا ہے۔ اس لئے درحقیقت سوال اس حالت کا ترجمان ہوتا ہے کہ سائل کا بطون خواہشات سے خالی نہیں ہے اس واسطے محققین مشرب عشق نے۔ اس مشروط سوال کی بھی بطور رخصت اجازت دی ہے ورنہ ہر صورت سے سوال کرنا منافی شان عشق ہے۔ کیونکہ عاشق کامل کی صحیح تعریف یہ ہے کہ اس کے مرادات ایسے فنا اور معدوم ہو جائیں کہ ہر حال میں حسد اسے کبھی سوال کرنے کی حاجت نہ ہو۔ بمصداق " اَلْفَقِیْرُ لَا یَحْتَاجُ اِلَی اللّٰہِ وَلَا اِلٰی غَیْرِہٖ "۔

ایک مرتبہ حضور قبلۂ عالم نے صفات صبر کے سلسلہ میں فرمایا کہ " اَلصَّبْرُ مِفْتَاحُ الْوَصْلِ " کہ صابرین شاہد حقیقی سے واصل ہو جاتے ہیں جس کی دلیل " اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ " ہے۔

ایک مرتبہ حضور قبلہ عالم نے فرمایا کہ اگر غور کرو تو دنیا کا انقلاب زبانِ حال سے کہتا ہے کہ اس بے ثبات دار فانی کو اپنا گھر نہ بناؤ۔ بقول۔

دانی کہ بر نگین سلیمان چہ نقش بود خط بزر نوشتہ کہ این نیز بگزرد

ایک خوشحال اور تعلیم یافتہ ہندو۔ جو اپنی پگڑی کی وجہ سے پنڈت۔ اور لباس کے رنگ اور وضع کے لحاظ سے درویش معلوم ہوتے تھے حضور قبلۂ عالم کی خدمت فیض درجت میں حاضر ہوئے۔ جناب حضرت نے فرمایا کہاں سے آئے ہو۔ عرض کیا بنارس سے۔ آپ نے خادم کو حکم دیا کہ اُن کو بنگلے میں ٹھہراؤ اور کھانے کا انتظام کر دو۔ کوئی تکلیف نہ

ہو۔ اور دو سیب مرحمت فرماکر ارشاد ہوا کہ جاؤ۔

بعد ظہر کے پھر دہ قدمبوسی کے واسطے حاضر ہوئے۔ سرکار عالم پناہ نے فرمایا۔ تمہارا کیا نام ہے۔ عرض کیا ہری داس۔ ارشاد ہوا کہ بنارس کے قدیم باشندہ ہو۔ عرض کیا نہیں۔ تعلیم کی غرض سے میں بنارس میں زیادہ رہا اور اس وقت بھی وہیں سے آتا ہوں۔ ورنہ استھان ضلع فیروزپور (پنجاب) میں ہے۔ اور نسباً گرو نانک شاہ کے خاندان میں سے ہوں۔ بزرگوں کی گدی ہے۔ جس پر والد کے بعد بقول حافظ شیراز "قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند" دربار صاحب نے مجھ کو بٹھادیا۔ حالانکہ اس لائق نہیں ہوں کہ کسی کو خدا سے ملنے کا راستہ بتاؤں۔ مگر رسم دنیا کے مطابق گدی کی سیوا کرتا ہوں۔ اور چند گاؤں ہیں جن کی آمدنی اس قدر آتی ہے کہ دس بیس سنت سادھو بھی کھاتے ہیں اور میں بھی آرام سے رہتا ہوں۔ مگر جب یہ خیال کرتا ہوں تو شرم آتی ہے کہ شیروں کی جگہ پر کتا بیٹھا ہے۔

عرصہ سے آپ کے دیدار کا اشتیاق تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ آج درشن ہوگئے۔ مہاتما جی اب تمنا یہ ہے کہ مجھ بھکاری کی جھولی بھر دو۔ بڑا دکھ یہ ہے کہ دھیان۔ گیان۔ جاپ جوگ۔ سب کچھ کیا مگر دل کی کھوٹ نہیں جاتی۔ تم شیر خدا کے پوت اور سنسار کے تارن ہار ہو۔ اپنی دیا سے میرے دل کی دوبدھا نکال دو۔ تو سدھ ہو جائے۔ ورنہ خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ کہ اس جنم میں جس کام کو آیا تھا وہ نہیں کیا۔

ارشاد ہوا کہ نانک شاہ کی گرہنت پڑھی ہے۔ ہری داس نے عرض کیا۔ ہاں مہاراج اسی کی سیوا کو تو اپنا پوجا۔ پاٹ جانتا ہوں۔ فرمایا۔ برم بچار کا پاٹ بھی پڑھا ہے۔ عرض کیا جی ہاں داتا۔ خوب پڑھا ہے۔ دربار صاحب نے تو برم بچار کو اور تم جوگ لکھا ہے۔ لیکن یہی کہہ دیا ہے کہ یہ گانٹھ جس نے کھولی گرمنتر سے کھولی ہے۔

سرکار عالم پناہ نے فرمایا۔ جب اس قدر وسیع النظر ہو تو یہ حکایت بھی دیکھی ہوگی کہ جب پہلا ذنے عالم ذوق میں۔ برم یعنی معبود مطلق کا نام جپنا شروع کیا اور اس

کے باپ نے جس کا نام ہرناکش تھا۔ یہ طریقہ اپنے مذہب کے خلاف دیکھ کر۔ لائق اور تپسّی بیٹے سے نہایت غضبناک ہو کر کہا کہ خبردار میرے آگے رام کا نام نہ لینا۔ ورنہ اس تلوار سے تیرا سر اڑا دوں گا۔

جب پہلاد نے باپ کی یہ بیجا مخالفت دیکھی۔ تو اس کو بھی جوش آ گیا۔ اور اسی عالمِ وجد میں اپنے باپ سے مخاطب ہو کر کہا کہ مجھ میں رام۔ تجھ میں رام۔ کھڑک کھم سب میں رام۔ یعنی مجھ میں۔ تجھ میں۔ تلوار اور اس ستون میں خدائے واحد کا جلوہ ہے۔

ادھر پہلاد کی زبان سے اثباتِ الٰہی کی تعریف میں یہ الفاظ نکلتے ہی تھے کہ ستون پھٹ گیا۔ اور اس میں سے نرسنگھ کی صورت شیر کے چولے میں نمودار ہوئی جس نے ہرناکس کو پارہ پارہ کر دیا۔

اس دیرینہ حکایت کا ماحصل یہ ہے کہ پہلاد برہم شناس کو اپنے باپ ہرناکس باطل پرست کے جواب میں حقیقت کے اس سرِ مخفی کو علی الاعلان ظاہر کرنا مقصود تھا کہ حضرت واجب الوجود کی یہ جلیل القدر شان۔ جس کو الوہیت کی کافی دلیل اور صمدیت کا عین برہان کہنا چاہیئے۔ کہ موجودات کا ہر ذرہ۔ اس کی قدرت و قوت کا شاہد صادق۔ اور اس کے صفاتِ جمیلہ اور صفاتِ جلیلہ کا شفاف آئینہ ہے۔ جس کی آنکھ سے دوئی کا حجاب اٹھ جاتا ہے اس کو ہر جگہ اور ہر چیز میں اس واحدہٗ لاشریک کا جلوہ نظر آتا ہے۔

اور اسی سلسلۂ تقریر میں جو چیزیں پیشِ نظر تھیں۔ پہلاد نے انہیں کا حوالہ دیا۔ اور دلوں کے حق پرستی میں بکمالِ صدق و یقین اشارہ کیا کہ مجھ میں۔ تجھ میں۔ کھڑک میں۔ کھم میں نرنکار جوتی سروپ کی تجلی موجود ہے۔

چونکہ پہلاد کا یہ قلبی اقرار اور زبانی اشارہ۔ از روئے تصدیق کامل تھا۔ اس لیئے یہ بھی لازمات سے تھا کہ جس طرح اس موحد نے۔ عالم جوش اور حالتِ وجد میں۔ اثباتِ قدرتِ الٰہی کا ایک باطل پرست کے مقابلہ میں دعویٰ کیا تھا۔ اسی طرح ہر چیز اثباتِ منشاء

سے شان حضرت احدیت کا اظہار ہوتا۔ لیکن یہ نہیں ہوا۔ اور واقعہ یہ پیش آیا کہ برم کی صورت صرف ستون سے نمودار ہوئی اور باقی تین چیزوں سے کسی قسم کے غیر معمولی آثار ظہور پذیر نہیں ہوئے۔

پس یہی مقام قابلِ غور ہے اور پہلے تم کو یہی سمجھنا چاہیے۔ کہ اس میں کیا راز مضمر تھا کہ برم کا جلوہ جبکہ ہر چیز میں ہے۔ تو پھر ستون کی کیا تخصیص تھی کہ اسی میں سے برم کی صورت شیر کی برزخ میں ظاہر ہوئی۔ جب اس کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ تب یہ حکایت سودمند بھی ہو گی اور پہلاد کی حقانیت سے سبق آموز بھی ہو سکتے ہو۔

یہ سن کے ہری داس متحیر ہو گئے۔ اور آبدیدہ ہو کر دست بستہ عرض کیا کہ گوسائیں جی مجھ ہیچمدان کی عقل عاجز اور ادراک قاصر ہے کہ برم کا ظہور ستون سے کیوں ہوا۔ ہاں یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ وہی بھید ہے جس کو عرفِ عام میں گرمنتر کہتے ہیں۔ اب مہاتما کرپا کرو۔ یہ گرُ تمہیں سمجھا سکتے ہو۔ یہ کہہ کر رونے لگے اور قدموں پر سر رکھ دیا۔

سرکار عالم پناہ کے کریمانہ مزاج کا دستور تھا کہ عموماً طالبین کی حالت پر یکساں شفقت عنایت فرماتے تھے اور نہ کبھی اس عنوان سے کہ ہدایت ایسی کی جاتی تھی۔ جو سائل کے حسب حال اور اس کے علم و مشرب کے مطابق اور عقل و ادراک کے موافق ہوتی تھی۔ مزید براں۔ ہری داس صاحب کے نیازمندانہ عجز نے اور بھی زیادہ متوجہ اور آمادہ کر دیا۔

چنانچہ آپ نے فرمایا کہ ہری داس یہ تو تم کو معلوم ہے کہ جس کے دل میں دودھا ہے اس کو برم کا درشن نہیں ہو سکتا۔ بلکہ دیکھ لو کہ جب پہلاد کا خیال منتشر رہا۔ اور کبھی کھمبہ میں اور کبھی تختہ میں اور کبھی کھڑک میں کہتا رہا۔ برم کی دید نہیں ہوئی۔ اور جب کھم۔ یعنی ستون پر آکر رک گیا اور خیال ایک مستقر پر قائم ہو گیا۔ تو برم کی صورت۔ یعنی خدا کا جلوہ۔ وہیں سے ظاہر ہو گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب انسان یقین کامل کے ساتھ ایک صورت کو مضبوط پکڑ لیتا ہے۔ اور بجائے تذبذب اور تردد کے خیال میں سکون اور یکسوئی ہو جاتی ہے جس کو اصطلاح صوفیہ میں تصدیق کہتے ہیں۔ تو طالب راہ خدا کو اسی صورت میں رسدہ۔ یعنی تجلیات انوار الہٰی کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس لئے تصدیق ایسا رفیع المرتبت مقام ہے جو بارگاہ ایزدی سے مقربین خاص کو تفویض ہوتا ہے۔ اور اسی حالت قلبی کو۔ بو علی شاہ قلندر نے " خیال پختہ کردن کار مردان است " سے تعبیر کیا ہے۔ پس جب تک خیال کو اطمینان اور استقلال نہیں ہوتا۔ اسرار الہٰی سے باخبر ہونا محال ہے۔

ہری داس مکیف ہو گئے۔ اور قدمبوس ہو کر عرض کیا کہ مہاراج بے شک اسی اپنچھر کا نام گرو منتر ہے۔ جس نے میری تمام عمر کے اکتساب علم کو کھول دیا۔ اب گوسائیں جی چیلا بھی کر لو۔

آپ نے فرمایا مرید بھی ہو جانا۔ محبت ہی کافی ہے۔ اگر محبت ہے تو ہزار کوس پر ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ جاؤ آج رہو۔ کل چلے جانا۔

ہری داس بے اختیار رونے لگے اور بکمال عجز و نیاز عرض کیا کہ مہاراج خالی ہاتھ نہ جاؤں گا۔ کوئی اپنچھر بھی ایسا بتا دو کہ پرماتما کے دھیان میں مگن رہوں اور دوسرے کا خیال نہ آئے۔

حضور قبلہ عالم نے مسکرا کر شغل سلطان الاذکار تعلیم فرمایا۔ اور یہ بھی بتاکید ارشاد ہوا کہ جب تک کافی اطمینان نہ ہو جائے۔ اپنی ظاہری حالت بدستور قائم رکھنا۔

ایک مرتبہ حضور قبلۂ عالم نے فرمایا " فقیر وہ ہے جو کل کے واسطے نہ رکھے اور قلب مطمئن رہے۔ کیونکہ حرص ذخیرہ ایسی بے ادبی ہے جو متوکلین کو عطیات الہٰی سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیتی ہے"۔

ایک قدیم ارادتمند نے حضور قبلۂ عالم کی خدمت میں عرض کیا۔ حسب ارشاد ہمارا

ایمان ہے کہ محبت وہبی ہے۔ اور اس کا بھی یقین ہے کہ کسب سے نہیں حاصل ہوتی لیکن کوئی صورت ایسی بھی ہے کہ محبت نہ سہی۔ لیکن محبت الٰہی کی جانب قلب کا میلان ہی ہو جائے تاکہ ہم اسی کو اپنے واسطے مایۂ امتیاز جانیں آپ نے متبسم لبوں سے فرمایا کہ محبت کرنے کا اگر بہت شوق ہے۔ تو یہ درود شریف کثرت سے پڑھا کرو۔ "اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِہٖ بِقَدْرِ حُسْنِہٖ وَ جَمَالِہٖ" اس کے ذاکر کا دل گداز اور سوز الفت سے مالوف ہو جاتا ہے۔

ایک مرتبہ حضور قبلۂ عالم نے فرمایا کہ تواضع کی تعریف مختلف الفاظ میں کی گئی ہے۔ مگر سب سے بہتر صفت یہ ہے اور بڑا متواضع اس شخص کو کہنا چاہیئے جو خلق کے ساتھ خُلق اور حق کے ساتھ صدق رکھتا ہے۔

ایک مرتبہ سرکار عالم پناہ نے فرمایا کہ حسن کا مقصود یہ ہونا ہے کہ طبیعت متواضع ہو جائے وہ اپنے ملنے والے کو پہلے سلام کرتے ہیں۔ اور اگر وہ سبقت کر جاتا ہے تو اس کے سلام کا جواب خُلق اور خندہ پیشانی سے دیتے ہیں۔

ایک مرتبہ حضور قبلۂ عالم نے فرمایا کہ اس کو بھی تواضع کہتے ہیں کہ جو شخص تمہاری تعریف کرے۔ تم نازاں نہ ہو۔ بلکہ خدا کا شکر کرو۔ اور جو کوئی غلط اور بطور اتہام بھی تمہاری مذمت کرے۔ تم اس سے عناد اور خصومت نہ رکھو۔

ایک مرتبہ مخدوم شاہ صاحب وارثی دریابادی نے۔ جو قبلۂ عالم کے دیرینہ تہبند پوش فقیر تھے۔ عرض کیا۔ مجھ کو یاد ہے کہ آپ نے فرمایا تھا کہ فقیر کو چاہیئے کہ کل کے واسطے نہ رکھے مگر اس سال قصبہ کے کاشتکاروں نے واللہ اعلم کس خیال سے یہ کیا کہ جب فصل ربیع کاٹی تو تھوڑا تھوڑا غلہ دعوت کے نام سے مجھ کو دے گئے۔ جس کی مقدار قریب تین چار من کے ہو گئی ہے۔ اگر صرف کرتا ہوں تو عرصہ تک میری ضرورت کے واسطے کافی ہوگا۔ لیکن جبکہ ایک دن کا بھی اس کا رکھنا آپ کے حکم کے خلاف ہے۔ تو رکھ بھی نہیں سکتا۔ اور نہ لیتا تو آپ کے اس حکم کی تعمیل نہیں ہوتی تھی کہ بے طلب جو آجائے

اس کو رد نہ کرنا۔ لہٰذا گذارش یہ ہے کہ اب وہ غلہ کیا کیا جائے اور آیندہ کے واسطے کیا صورت اختیار کروں۔

آپ نے فرمایا۔ تم یہ کرو کہ جس طرح وہ رازق مطلق ضرورت سے زیادہ تم کو رزق پہونچائے اسی طرح تم بھی بقدر حاجت رکھ لو۔ اور باقی شام تک راہ خدا میں تقسیم کر دیا کرو۔ وہ بندہ نواز۔ جو تمہاری قسمت کا ہے روز تم کو پہنچائے گا۔ جاؤ"

دیوی شریف میں ایک صاحب مشائخانہ مگر نفیس لباس پہنے حاضر خدمت ہوئے تہذیب گفتگو کے لحاظ سے ذی علم بھی معلوم ہوتے تھے۔ حضور قبلۂ عالم نے بہ اخلاق تمام اُن سے معمولی گفتگو فرما کر حسب دستور رخصت کر دیا۔ انہوں نے بکمال ادب عرض کیا کہ یہ فقیر آپ کے در سے خالی نہ جائے گا۔ کوئی نصیحت ایسی فرمائی جائے جو دارین کے واسطے مفید ہو۔

حضور قبلۂ عالم نے فرمایا "یہ مسلمہ ہے کہ جس طرح تواضع عقلاً و نقلاً محمود صفت ہے اور یوں تو عموماً ہر شخص کے لئے فروتنی اچھی ہوتی ہے۔ مگر خصوصاً دولتمندوں کے واسطے بہت زیادہ فائدہ مند ہے۔ اسی طرح کبر ایسی ذلیل اور مذموم خصلت ہے کہ ہمیشہ عوام کی بھی دینی اور دنیوی خرابی کا باعث رہا ہے۔ اور خصوصاً فقیر کے حق میں۔ تکبر نہایت نقصان رساں دشمن ہے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ کسی نے اپنے ہم عصر حکیم سے یہ سوال کیا کہ آپ جانتے ہیں وہ کون نعمت ہے۔ جس پر کسی کو حسد نہ ہو اور وہ بدترین بلا کون ہے کہ اس بلا پر کسی کو رحم نہ آئے۔ حکیم نے کہا کہ وہ نعمت تواضع ہے اور وہ بلا تکبر ہے اس نے عام طور پر سب کو۔ اور فقیر کو لازمی ہے کہ زمین کو دیکھے اور آسمان کی طرف سر نہ اٹھائے۔

ایک مرتبہ حضور قبلۂ عالم فتحپور ت پنہتے پور تشریف لے گئے۔ اور دو روز وہاں قیام فرمایا۔ اس دوران میں علاوہ دیگر واقعات کے ایک غیر معمولی واقعہ یہ پیش آیا کہ آپ نے یا تو کسی وقت اس بشارت کا ذکر کیا کہ "پیر اپنے مرید کا ہر حال میں نگراں

اور معادن رہتا ہے۔" اور کبھی اسی مضمون کو دوسرے الفاظ میں یوں فرمایا کہ" وہ پیر ناقص ہے جو مرید سے دور رہے۔ خصوصًا مرتے وقت اس کی اعانت نہ کرے۔"

اور کسی وقت آپ نے قناعت کی بہ تکرار ہدایت فرمائی اور رازق مطلق کے وعدۂ رزق رسانی کی مختلف عنوان سے تعریف کی۔ چنانچہ کبھی یہ فرمایا کہ" جمعیت خاطر انہیں کو ہوتی ہے۔ جن کو اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّۃِ الْمَتِیْنُ" کا یقین کامل ہوتا ہے۔ کبھی ارشاد ہوا کہ" جن کو تصدیق ہے کہ رزق کا ضامن رزاق مطلق ہے وہ ماسوا اللہ سے مستغنی ہو جاتے ہیں۔" کبھی یہ فرمایا کہ" جو خدا کے وعدہ پر اعتماد نہیں کرتا اس کا ایمان ناقص ہے۔" کسی وقت ارشاد ہوا کہ" جو مسبب الاسباب پر بھروسا کرتا ہے۔ اس کے ایمان کی خدا نے گواہی دی ہے۔ کہ" فَتَوَکَّلُوْا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۔" کبھی فرمایا کہ" رازق العباد نے ہمارے اطمینان کے واسطے قسم کے ساتھ رزق رسانی کا وعدہ فرمایا ہے کہ" وَفِی السَّمَآءِ رِزْقُکُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّہٗ لَحَقٌّ۔" بس بدترین خلق وہ شخص ہے جو اپنے خالق اور رازق کی قسم کا بھی اعتبار نہیں کرتا اور سبب و اکتساب کو اپنی معاش کا ذریعہ سمجھتا ہے۔"

غرض سرکار عالم پناہ نے تقریبًا ہر جلسہ میں۔ عام مریدین سے بھی اور خاص مسترشدین سے بھی مخاطب ہو کر اسی نصیحت اور اسی ہدایت کا ذکر متواتر اور ایسے تحکم آمیز لہجہ میں فرمایا جس سے نمایاں طور پر معلوم ہوتا تھا کہ آپ کو منظور یہ ہے کہ ہمارے جملہ دست گرفتہ پیر کی حقانیت اور خدائے برتر کی ربوبیت سے کما حقہٗ آگاہ ہو جائیں۔

مگر باوجود کافی غور کرنے کے۔ کسی کو احساس نہیں ہوا کہ ہدایات مذکورہ کا خطاب عام ہے یا روئے سخن کسی مخصوص ارادتمند کی جانب ہے۔

اس وجہ سے بعض خدام متوحش تھے۔ جن کو دیکھ کر اخی محترم شاہ مقصود علی صاحب

جو بارگاہ وارثی کے نہایت پُرجوش اور قدیم حلقہ بگوش تھے۔ اور اس وقت تو آقائے نامدار کے انہیں خاص میزبان ہونے کا شرف حاصل تھا۔ آبدیدہ ہو کر کہنے لگے کہ برادر آپ متردد نہ ہوں۔ بہ قرینہ غالب یہ تنبیہہ مجھ گنہگار کی ہو رہی ہے۔ کیونکہ غلامانِ وارثی کے اس مجمع کثیر میں ایک یہی سگِ دنیا ایسا حریص اور طامع ہے۔ جس کا مکدر قلب اپنے عدم اطمینان کی وجہ سے رازقِ مطلق پر بھروسا نہیں کرتا۔

حتیٰ کہ وہ دونوں دن اسی تشویش میں گزرے۔ اور تیسرے روز حضور قبلۂ عالم موضع سجینا روانہ ہوئے۔ راستہ میں آپ کی پالکی ایک گنجان مگر سرسبز جنگل میں سے گزری تو آپ نے فرمایا کہ "یہ بہت پُرفضا مقام ہے۔ ہوا خوب آتی ہے۔ آج یہیں رہ جائیں"۔

یہ سُن کے جملہ خدام نے عرض کیا کہ یہاں کے قیام میں تکلیف ہوگی۔ کیونکہ کوئی گاؤں بھی قریب نہیں ہے۔ مگر آپ نے اُن کے معروضات پر التفات نہیں فرمایا۔ بلکہ پالکی سے اتر کر کھڑے ہوگئے۔ مجبوراً خادم نے ایک شاداب درخت کے سایہ میں فرش بچھا کر آپ کا بستر استراحت لگا دیا۔ اور دوسرے درخت کے نیچے اپنے بیٹھنے کا انتظام کیا۔

تھوڑے عرصہ میں دو شخص اسی جوار کے باشندہ حاضرِ خدمت ہوئے۔ اور ایک ظرف میں تقریباً تین چار سیر دودھ تھا۔ وہ پیش کر کے اپنی دہقانی زبان میں عرض کیا کہ شام کی دعوت قبول ہو۔ ہم یہیں کھانا لائیں گے۔ اور جب حضور نے منظور فرما لیا۔ تب واپس گئے۔

بعد مغرب وہی دونوں شخص اس ہیئت سے سامان دعوت لائے کہ ایک کے سر پہ ٹوکرا۔ جس میں روٹیاں اور ایک ہانڈی اور ایک پتیلی تھی۔ اور دوسرے کے ایک ہاتھ میں لالٹین اور ایک میں پانی کا گھڑا تھا۔

چنانچہ خادم نے دسترخوان بچھایا۔ اور حضور نے وہی کھانا تناول فرمایا۔ اور اسی کھانے سے جملہ خدام بھی سیر ہوگئے۔ اور جو باقی بچا وہ واپس کیا گیا۔ اور سرکار عالم پناہ نے ان میزبانوں کو ایک تہبند مرحمت فرما کر رخصت کر دیا۔

صبح کو سب لوگ ہنوز ضروریات سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ ایک اجنبی شخص آیا۔ اور قدمبوس ہوکر عرض کیا کہ دو بجے رات کو محبوب شاہ کا انتقال ہوگیا۔ آپ نے خادم کو حکم دیا کہ ایک تہبند اور پانچ روپئے ان کو دیدو اور اُس سے مخاطب ہوکر ارشاد ہوا کہ یہ تہبند کفن کے واسطے ہے۔ اور صحنِ مسجد میں جو قبر ہے۔ اس کے برابر دفن کر دینا اور خود سوار ہوکر بجیپنا تشریف لے چلے۔

اس واقعہ کے بعد ہم لوگ سمجھے کہ حضور قبلۂ عالم نے جو بیتے پور میں بشارت دی تھی۔ او جس ہدایت میں قناعت کی متواتر تاکید فرمائی تھی اس کو برائ العین بھی دکھا دیا کہ اپنے دست گرفتہ کی دمِ آخر اعانت بھی فرمائی اور رزاق مطلق نے جنگل میں رزق بھی پہونچادیا۔

المختصر حضور قبلۂ عالم کے ہفتاد سالہ ہدایات میں سے۔ اس رسالہ میں جس قدر ارشادات تمثیلاً نقل ہوئے ہیں۔ انہیں کے مطالعہ سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے آقائے نامدار نے اپنے غلاموں کو مذہبی اور مشربی عقائد اور اعمال سے متواتر آگاہ کیا۔ اور اس کی کوشش فرمائی کہ ان کے عادات اور معاملات درست اور شائستہ ہوجائیں۔ اس لئے جس دست گرفتہ کے حق میں جو ہدایت مناسب اور مفید متصور فرمائی۔ اس کی تعمیل کا اس کو خصوصیت کے ساتھ حکم دیا ورنہ وہ صفات و اخلاق جو انسان کو درحقیقت انسان بلکہ کامل الایمان بناتے ہیں ان کو عام طور سے مشتمل بتاکید بیان کیا۔

اور یہ عنایت و پرورش صرف مریدین ہی پر موقوف نہ تھی۔ بلکہ ہر خاص و عام کی رہنمائی کے واسطے ہمارے شفیق مربی کا باب فیض ہمیشہ کشادہ رہا۔ اور جہاں اور جس وقت کسی مذہب و ملت کا پیرو طالب راہ حق ہوکر۔ خدمت والا میں آیا۔ اور ہدایت کا خواستگار ہوا۔ ہمارے بندہ نواز رہنما نے بغیر کسی تخصیص اور تفریق کے۔ بکمال شفقت اس کی تشفی اور دستگیری فرمائی۔ اور کم از کم اپنے تصرف باطنی سے اس کو محبت الٰہی کا شوق ضرور تفویض فرمایا۔ اور اگر مناسب متصور ہوا تو کسی اسم جناب باری کے ورد

کی بھی اس کو ہدایت کی۔

چنانچہ سب کو معلوم ہے کہ دربار وارثی کا یہ دستور تھا کہ بغیر رسمی و سفارش کے مشتاق زیارت ہر وقت حاضر خدمت بابرکت ہو سکتا تھا۔ اور حضور قبلۂ عالم اپنے خلق عمیم کے لحاظ سے ایسی غیر معمولی پرورش فرماتے تھے کہ وہ مطمئن اور محظوظ ہو کر جاتا تھا۔

البتہ خدام بطور خود سرکار عالم پناہ کے آرام کے خیال سے یہ انتظام بھی کرتے تھے کہ خاصہ نوش فرمانے کے بعد دو گھنٹہ کے واسطے تخلیہ رکھتے تھے۔ اور اس دوران میں بجز حاضر باش خدمت گزاروں کے۔ دیگر حلقہ بگوش عام طور پر حاضر ہونے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔

لیکن کوئی ناواقف اگر جوش عقیدت اور شوق زیارت میں۔ یا بہ ارادۂ حصول شرف بیعت اس وقت خاص میں بھی حاضر خدمت ہو جاتا تھا۔ تو حضور قبلۂ عالم بہ وفور عنایت کریمانہ اس خلل انداز عافیت کی ہدایت میں بھی دریغ نہیں فرماتے تھے۔

یہ بھی دیکھا ہے کہ دوران سیاحت میں قریب قریب ہر اسٹیشن پر ارباب ارادت کے ساتھ اہل عقیدت کا بھی ہجوم ہوتا تھا۔ جن میں بعض قدمبوس ہونا چاہتے۔ بعض کو کچھ عرض حال کرنا بھی مطلوب ہوتا تھا۔ بعض داخل سلسلہ ہونے آتے تھے مگر اس کشمکش میں بھی آپ اہل حاجت کی فریاد سنتے اور نہایت شفقت سے امداد کرتے۔ اور طالبین کی رہنمائی فرماتے تھے۔

یہ واقعات بھی روزمرہ پیش آتے تھے کہ اکثر ایسے طالبین جو بہیئت ناداری حاضر نہیں ہو سکتے تھے، یا نقاہت کبرسنی کے باعث سفر کرنے سے معذور تھے وہ بذریعہ عرضداشت اپنی ارادت پیش کرتے تھے تو آپ کے فیض عام سے وہ بھی محروم نہیں رہتے تھے فوراً خادم کو حکم ہوتا تھا کہ لکھ دو۔ "تم مرید ہو گئے۔ یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اکثر حضرات یہ نگارش کرتے تھے کہ ہم نے عالم رؤیا میں آپ سے بیعت کی ہے۔

لہٰذا حلقہ مریدین میں ہم داخل ہیں۔ یا ظاہری بیعت کی بھی ضرورت ہے۔ ارشاد ہوتا تھا "لکھدو۔ تم مرید ہو گئے"۔

چنانچہ حاجی اوگھٹ شاہ صاحب وارثی نے اپنے رسالہ ضیافت الاحباب میں ایسے واقعات متعدد بصراحت نقل کئے ہیں۔ مگر حضور قبلۂ عالم کا اہتمام قابل غور ہے کہ ہمہ وقت بندگان خدا کی حمایت اور ہمدردی کرنا کس قدر اہم ، اور دشوار کام ہے۔ لیکن ہمارے خضر طریقت نے۔ باوجود دائمی استغراق اور مستقل محویت کے ستر سال تک یہی کوشش فرمائی کہ مخلوق اپنے خالق حقیقی سے مالوف ہو جائے۔

مگر اس تمام عمر کی مسلسل ہدایت کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے تصرف اور توجہ سے علاوہ اہل اسلام کے اکثر ارباب غیر مذاہب نے زبانِ حال سے لبیک کہا اور اس قدر حلقہ بگوش آپ کے ظلِ حمایت میں پناہ گزیں ہوئے۔ جن کا شمار کرنا انسان کے امکان واختیار سے باہر ہے۔

اور سرکارِ عالم پناہ کی عنایت سے اس کثیر التعداد گروہ میں ہزاروں اہل دید یافت بھی ہوئے۔ اور سینکڑوں نے میدانِ محبت میں اپنی ہستی کو ہستئ شاہد مطلق کے سامنے نیست و نابود کر دیا۔ جن کے ثبات واستقلال کے کارناموں کو اگر یادگار زمانہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

مگر کم سے کم حضور قبلۂ عالم کا یہ فیض عام تو قریب قریب جملہ مسترشدین کا مخصوص حصہ تھا کہ سلسلۂ وارثیہ کا ہر فرد اثراتِ محبت سے متاثر ضرور تھا۔

اب مجھ جیسا نااہل وتیرہ دروں بھی بطور شکایت یہ نہیں کہہ سکتا کہ فیضان وارثی نے مجھ کو مستفیض نہیں کیا بلکہ اپنی ناکامی اور نامرادی کا سبب۔ اپنی بدبختی اور تنگ ظرفی کو قرار دیگا اور از روئے انصاف کہنے گا تو یہی کہے گا۔

ہر چہ ہست از قامت ناساز و بی اندام ماست　　　ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

شدتِ ضعف | حتیٰ کہ کثرتِ ضعف اور شدتِ علالت میں بھی ہمارے مقتدائے عالم کا سلسلہ رشد و ہدایت بدستور جاری رہا۔ چنانچہ سنہ ۱۸۹۹ء میں جب نور محمد شاہ صاحب خادم خاص معزول ہوئے اور حاجی فیضو شاہ صاحب کا اس ممتاز عہدہ پر تقرر ہوا تو نواب عبدالشکور خاں صاحب وارثی رئیس دھرم پور ضلع بلند شہر۔ اور ٹھاکر پنچم سنگھ صاحب وارثی رئیس ملاؤلی ضلع مین پوری نے بعد عجز و نیاز حضور قبلۂ عالم کی خدمت بابرکت میں عرض کیا کہ اس میں شک نہیں کہ ایسی نقاہت میں سفر میں تکلیف دینا گو صریح بدتمیزی ہے۔ مگر خیال یہ ہے کہ آب و ہوا بھی تبدیل ہو جائے گی۔ اور ہم غلاموں کی یہ دلی تمنا بھی پوری ہوتی ہے۔ جس کی آپ کی لونڈیوں کو بھی آرزو ہے۔ کہ بندہ نواز ایک مرتبہ اور ہمارے غریب خانہ پر قدم رنجہ فرما کر عزت افزائی فرمائیں۔

چنانچہ جب ہر دو حضرات نے متواتر اصرار کیا تو سرکار عالم پناہ نے اپنے دونوں خدمت گذاروں کے صدق اخلاص نظر فرما کر۔ ان کی اس محبت آمیز التماس کو بھی منظور کیا۔ اور آخر اکتوبر ۱۸۹۹ء میں بریلی کی جانب سے آپ دھرم پور تشریف لے گئے۔ اس سفر میں ہر مقام پر طالبین کا ہجوم ہوا۔ اور رہنمائے برحق نے سب کی دستگیری فرمائی اور اکثر غلاموں کو خلعت فقر بھی مرحمت ہوا۔

مگر علاوہ دیگر واقعات کے جن کی تصریح میں بہت زیادہ طوالت ہوگی۔ اس سفر میں ایک غیر معمولی بات یہ دیکھی گئی۔ کہ منجملہ اوراد و ہدایات و ارشادات کے اکثر اوقات مختلف دوران گفتگو میں آپ نے یہ فرمایا کہ" دیوی کے لوگ یہ کہتے ہیں کہ اب کہیں نہ جایا کرو" اور کبھی یہ ارشاد ہوا کہ" دیوی کی بیبیاں یہ کہتی ہیں کہ سید واڑہ کے لوگ تو کہیں جاتے نہ تھے۔ تم کیوں ہمیشہ باہر پھرا کرتے ہو۔ اور کبھی یہ فرمایا کہ" ایک بڑے حکیم یہ کہتے ہیں کہ ہر جگہ کا آب پانی پیتے ہیں۔ اسی وجہ سے قبض رہتا ہے" غرض علی گڑھ۔ ہاتھرس۔ آگرہ۔ شکوہ آباد۔ ملاؤلی۔ اٹاوہ وغیرہ کی ...

جب حضور اقدس اناؤ میں تشریف فرما ہوئے، تو سماۃ بنو دارثیہ سے۔ جو آقائی نامدار کی عاشق زار تھیں۔ اور جن کے قابل یادگار حالات سے قریب قریب جملہ غلامان بارگاہ وارثی خبردار ہیں۔ مخاطب ہو کر ارشاد ہوا کہ "بنواب لکھنؤ سے آکر تم کبھی کہیں نہ جانا"۔
بعدہ لکھنؤ میں جب رونق افروز ہوئے تو جس بنگلہ میں آپ قیام فرماتے تھے وہ بھی سماۃ بنو کی ملک میں تھا۔ اس کو مرمت طلب دیکھ کر فرمایا۔ "بنواب اس کی مرمت نہ کرانا"۔ اور بنو وارثیہ کے ملازمین کو غیر معمولی انعام دے کر ان کے حق میں فرمایا۔ "تم نے ہماری بہت خدمت کی ہے"۔

اور بعض ایسے معمر ارادتمند۔ جو باقتضائے کبرسنی اور ضعف بصارت بدشواری حاضر خدمت ہوئے تھے۔ ان سے آپ نے معانقہ کیا۔ اور رخصت کرنے کے وقت کسی کو اپنا ملبوس مرحمت فرمایا اور کسی سے ارشاد ہوا۔ "گھبرانا نہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں"۔

اس مضمون کے ارشادات۔ علاوہ عام مسترشدین کے۔ خدام خاص نے بھی متواتر سُنے مگر اس رمز کو کوئی نہ سمجھا کہ درپردہ اس کا اشارہ ہے کہ ہماری سیر و سیاحت کا زمانہ ختم ہوتا ہے۔ اور مختلف پیرایہ میں یہ پیغام وداعی ہے۔

اور ایسا ہی ہوا کہ پھر حضور قبلۂ عالم نے قرب و جوار کا بھی سفر نہیں فرمایا۔ کیونکہ لکھنؤ سے گو بعافیت تمام آپ دیوی شریف میں تشریف فرما ہوئے۔ اور بظاہر نہ تکان سفر کی کوئی شکایت تھی۔ اور نہ کوئی جدید مرض لاحق ہوا۔ مگر طبیعت بہت زیادہ ضعیف اور مضمحل ہو گئی۔ جس کو اطبا نے اقتضائے عمر تجویز کیا۔ اور مقویات و مفرحات کے استعمال سے چند روز میں گونہ سکون بھی ہو گیا۔ حالانکہ وہ افاقہ قابل اطمینان نہ تھا۔ تاہم جملہ غلامان وارثی کو مسرت ہوئی۔

اسی دوران میں ایک روز بعض قدیم ارادتمند۔ دیوی شریف کے بعض خدمتگزاروں کی معیت میں حضور قبلۂ عالم کے سامنے دست گرفتہ کھڑے ہوئے اور بکمال ادب عاجزانہ

ہو ہیں عرض کیا کہ۔ آقائے من آپ کے در سے کبھی کوئی سائل خالی نہیں گیا جس نے جو مانگا۔ آپ نے وہی دیا۔ آج یہ قدیم نمکخوار بھی۔ اس امید پر۔ آپ کی شکایت آپ ہی سے کرنے آئے ہیں کہ آپ پنجتن پاک کے حقیقی یادگار ہیں۔ انصاف کے ساتھ ساتھ ہماری امداد بھی ضرور فرمائیں گے۔ اور ہم بھی حضور کے آستانۂ پاک سے خالی نہ جائیں گے۔

سرکار عالم پناہ نے فرمایا۔ کیا شکایت ہے۔ اور کیا مانگتے ہو۔ اس کریمانہ آواز پر سب نے آبدیدہ ہو کر عرض کیا کہ جناب والا نے۔ اس حالت ضعف میں پانچ سو میل کی سیاحت فرمائی۔ جس کی تکان ناقابل برداشت ثابت ہوئی۔ گو یہ ہمارا قصور ہے کہ بوقت روانگی اختلاف کی جرأت نہیں کی۔ جس کی حقیقت یہ ہے کہ اس وقت آپ کے عتاب کے خوف سے خاموش رہے مگر آج صاف صاف عرض کرتے ہیں کہ اس گستاخی کی جو سزا آپ تجویز فرمائیں گے۔ اس کے لئے ہم سر جھکا دیں گے۔ مگر جب تک آپ کی صحت کا یہ حال ہے ہم دیویٰ شریف سے باہر آپ کو جانے نہ دیں گے۔ جس کو محبت ہو گی یہیں آئے گا۔ لہذا امیدوار ہیں کہ جس طرح ہمیشہ ہماری پرورش ہوئی ہے اسی طرح یہ استدعا بھی منظور ہو اور فرما دیجئے کہ نہ جائیں گے۔

حضور قبلۂ عالم نے مسکرا کے فرمایا کہ اگر ہمارا دل گھبرایا تو کیا کرو گے۔ اس کے جواب میں بعض خدمت گذار زار زار رونے لگے اور بے قرار ہو کر قدموں پر گر پڑے اور عرض کیا کہ ہم کو خوب معلوم ہے کہ آپ کا دل بہلانا بہت دشوار ہے۔ لیکن بقدر امکان کوشش کریں گے اور جب کسی صورت سے کامیاب نہ ہوں گے تو ہم یہ کریں گے کہ اپنے چہرے کو سیاہ اور سفید رنگوں سے رنگ کر آپ کے سامنے ناچیں گے۔ قرینہ ہے کہ جناب والا وہ بے ڈھنگا ناچ دیکھ کر ضرور مسکرا دیں گے۔

یہ سُن کے ہمارے بندہ نواز دستگیر نے اپنے غلاموں کو سینے سے لگا لیا اور ارشاد ہوا کہ ہم کو یقین ہے کہ ہماری محبت میں تم وہ کرو گے۔ جو کسی نے نہیں کیا۔ اچھا

نہ جائیں گے۔ اور شیرینی وغیرہ دے کر سب کو رخصت فرمایا۔

یہ خبر کہ اب حضور قبلۂ عالم سیر و سیاحت نہ فرمائیں گے اس قدر جلد مشہور ہوئی کہ ہندوستان کے ہر گوشہ سے غلامان وارثی کے خطوط آئے اور قیام فرمانے کا سبب دریافت کیا۔ اور اکثر نے بذریعہ تار مزاج پرسی کی۔

اور یہ سلسلہ تو مستقل طور پر جاری ہو گیا کہ روزانہ قرب و جوار۔ و نیز دیگر دیار و امصار سے اہل عقیدت بکثرت حاضر خدمت ہو کر جناب حضرت کے فیض عام سے مستفیض ہوتے تھے۔

بلکہ بعض حلقہ بگوش وطن مالوف کو خیرباد کہہ کر بطور ہجرت دیویٰ شریف میں اقامت گزیں ہو گئے اور بعض قدیم خرقہ پوش بھی آستانۂ اقدس پر ہمہ وقت حاضر رہنے لگے۔ مثلاً حاجی اوگھٹ شاہ صاحب اور حاجی لنٹ علی شاہ صاحب نے حسب ارشاد سرکار عالم پناہ در دولت پر قیام کیا۔ اور جو خدمات سپرد ہوئیں۔ ان کو نہایت خوبی سے انجام دیا۔

اس دوران قیام میں حضور قبلۂ عالم نے ارادتمندوں کو خلعت فقر بھی زیادہ تقسیم فرمایا جن میں اکثر اپنے وطن مالوف میں اقامت گزیں اور بعض سیر و سیاحت میں مصروف ہوئے۔ لیکن حافظ احمد شاہ صاحب وارثی اکبرآبادی اور شاہ شاکر صاحب وارثی متوطن اٹاوہ۔ اور کلی شاہ صاحب وارثی۔ جونپوری نے روزانہ کی آستان بوسی کو سرمایہ ناز جانا۔ بلکہ کلی شاہ صاحب اور حافظ احمد شاہ صاحب تو دیویٰ شریف ہی میں جان بحق تسلیم ہوئے اور شاہ شاکر صاحب آج تک اسی خیال میں منہمک ہیں اور مزار پر انوار کی خدمت کرتے ہیں۔

علیٰ ہذا شیخ عنایت اللہ صاحب وارثی۔ تعلقدار سید نپور۔ ضلع بارہ بنکی۔ اور راجہ دوست محمد خاں صاحب وارثی۔ تعلقدار موہنہ۔ ضلع سلطان پور۔ جو عرصہ سے اپنے اپنے مکان پر۔ عید الضحیٰ اور عید الفطر کی تقریب میں نہایت اولوالعزمی سے

حضور قبلۂ عالم کی دعوت کرتے تھے۔ وہ بھی آپ کے اس مستقل قیام کی وجہ سے اپنا سامان لاکر دیوی شریف میں اعلیٰ پیمانہ پر عید اور بقر عید کرنے لگے۔

یہ بھی شاید سنہ ۱۹۱۵ء کا واقعہ ہے کہ ایک مقتدر شخص جن کے ہمراہ چند ملازم۔ اور وافر اسباب سفر تھا۔ مگر اس قدر غیر مانوس کہ خدام خاص بھی ان کی صورت سے ناآشنا تھے۔ اس عنوان سے آئے۔ جو انداز قدیم ہمیشہ آنے والے ارادتمندوں کا ہوتا ہے کہ بے تکلف حضور قبلۂ عالم کی خدمت فیض درجت میں حاضر ہوئے۔

اور اس سے عجیب بلکہ عجیب تر صورت یہ پیش آئی کہ سرکار عالم پناہ نے صرف یہ فرما کر کہ "ڈپٹی آگئے"۔ اور اسی وقت لباس فقر دے کر گمنام شاہ خطاب مرحمت فرمایا اور یہ حکم دے کر رخصت بھی کر دیا کہ "ایسے مقام پر رہنا جو گزرگاہ عام نہ ہو۔ اور خلق سے بے تعلق اور خالق کی محبت میں مصروف رہنا اور جو شغل تمہارا ہے اس سے غافل نہ ہونا اور کسی ابتلا میں گھبرانا نہیں۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ جاؤ"

اسی کے ساتھ اس تازہ گرفتار دام محبت کا ثبات و استقلال یہ دیکھا کہ نہایت خندہ پیشانی سے دست بستہ ہو کر عرض کیا کہ اگر آپ کا افضال شامل ہے تو انشاءاللہ سرتابی کا خیال بھی نہ آئے گا اور باہر آکر کچھ اسباب اور روپیہ ملازمین کو دے کر مظفر پور واپس کیا۔ اور بقیہ اسباب اور روپیہ مساکین پر تقسیم کر دیا اور آستانۂ اقدس کے صدر دروازہ کی چوکھٹ چوم کر۔ سب کو سلام کرتے ہوئے چلے گئے۔

اور اوائل سنہ ۱۳۲۱ ہجری میں ایک نوجوان افغانی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور زبان پشتو میں اپنے مرادات کا اظہار کیا۔ حضور قبلۂ عالم نے بھی پشتو میں جواب دیا۔ اور مرید فرما کر خادم کو حکم ہوا کہ خان صاحب کو کمرہ میں ٹھہرا دو۔ اور ان کے کھانے کا خیال رکھنا۔

مگر وہ اس قدر مضطرب الحال تھے کہ سب کو اپنا پُرسوز قصہ سنا کر ہمدردی چاہتے

تھے۔ مگر پشتو کوئی نہ جانتا تھا اس لیے جواب نہ ملنے سے وہ اور زیادہ پریشان ہوتے تھے۔
اتفاق سے دوسرے روز ایک پنجابی تاجر پشمینہ آ گئے ان کی ترجمانی سے یہ معلوم ہوا
کہ نادر خاں ان کا نام ہے اور امیر والیٔ دیر کی رعایا ہیں۔ عالم رویا میں حضور اقدس کی زیارت
کا شرف حاصل ہوا۔ اور شوق دید میں کشاں کشاں یہاں آئے۔ اور اب طالب لباس فقر ہیں۔

تیسرے روز سرکار عالم پناہ نے۔ پشتو میں کچھ فرما کر۔ ان کو رخصت کر دیا۔ مترجم سے معلوم ہوا کہ
حکم ہوا ہے کہ جاؤ۔ ماں باپ کی خدمت کرو تین سال کے بعد آنا۔ اس وقت فقیر ہو جانا۔ القصہ حال ان کا آئندہ نقل کرونگا۔

غرض وہ اہل ارادت و عقیدت۔ جو ہمیشہ اپنے وطنوں میں جناب حضرت کی زیارت
سے مستفید ہوتے تھے اب ان کو حصول سعادت قدمبوسی کے لئے دیوی شریف میں حاضر ہونا
لازمی ہو گیا۔ لیکن باوجود اس احتیاط کے حضور قبلۂ عالم کی نقاہت میں تخفیف نہیں ہوئی۔ بلکہ
تھوڑا غور کرنے سے محسوس ہوتا تھا کہ ضعف میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے۔

کیونکہ دو چار مہینے قبل تک یہ صورت تھی کہ آپ کی رفتار و گفتار سے۔ یا روزمرہ کے
عادات میں ناتوانی کا اظہار ہوتا تھا۔ مگر اب تو نمایاں طور پر دیکھتے تھے کہ آپ کو نشست و
برخاست میں تکلف ہوتا ہے۔

مزید براں ۱۹۰۳ء مطابق ۱۳۲۱ھ ہجری میں حضور قبلۂ عالم کے مثانہ میں حدت پیدا
ہو گئی۔ حالانکہ باقتضائے مشرب سرکار عالم پناہ نے اس ناقابل برداشت اذیت کا نہ ذکر
فرمایا۔ اور نہ آپ کے غیر معمولی ضبط و تحمل کی وجہ سے کوئی صورت اضطراری ایسی ظاہر ہوتی جس کو
دیکھ کر اس جاں گداز تکلیف کو خدام تمیز کرتے۔ مگر شدائد مرض کے اثرات سے جب آپ
کے رخ انور پر افسردگی کے آثار پائے گئے۔ تب خدمت گزاروں کو خیال ہوا کہ طبیعت
زیادہ ناساز ہے۔

دوسرے روز جب استنجا کرنے آپ چوکی پر تشریف لے گئے۔ اس وقت خادم
کو اس کا اندازہ ہوا کہ آپ کو پیشاب کرنے میں شدید تکلیف ہوتی ہے۔ جس سے چہرۂ اقدس

کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے۔

فوراً حکیم عبدالخالق صاحب کو جو ریاست گدیہ میں ملازم تھے۔ بلایا۔ اور خدام نے جو کیفیت دیکھی تھی بیان کی چونکہ حکیم صاحب موصوف۔ حضور قبلۂ عالم کے مزاج ہمایوں کی اس گراں قدر شان سے بخوبی واقف تھے کہ آپ شدائد مرض کا اظہار اشارتاً بھی نہیں فرماتے ہیں۔ اس واسطے حال دریافت کرنے کے لئے یہ پیرایہ اختیار کیا کہ نبض دیکھ کر کمال اطمینان عرض کیا کہ ماشاءاللہ طبیعت آپ کی اچھی ہے۔ مگر قرینہ ہے کہ پیشاب کرنے میں شاید کچھ تکلیف ہوتی ہوگی۔

چونکہ حکیم صاحب کی یہ تقریر بصورت استفہام تھی۔ اس لئے حضور قبلۂ عالم نے جواب تو دیا۔ مگر بجائے اقرار یا انکار کرنے کے متبسم لبوں سے یہ ارشاد فرمایا کہ "تم بڑے حکیم ہو"

بس حکیم صاحب نے مفرحات کے ساتھ مدر ادویات کا استعمال کرایا۔ اور بعض خارجی تدابیر کی خدام کو ہدایت کی۔ چنانچہ اسی روز افاقہ ہوا اور دوسرے دن یہ تکلیف بالکل رفع ہوگئی۔ مگر شدائد مرض کی تکان سے ضعف بہت زیادہ ہوگیا۔

اور ضعف میں یوماً فیوماً ترقی ہونے کا بظاہر ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ غذا آپ نے بہت کم کردی تھی۔ حالانکہ حالت صحت میں سیر شکمی سے آپ کو ہمیشہ احتراز رہا باوجود یکہ خاصہ تناول فرمانے کے وقت خادم ہر چیز کی جانب آپ کی توجہ کو مبذول کرتے تھے۔ مگر آپ قلیل غذا فرماتے تھے۔ لیکن اس قلیل غذا میں بھی اس قدر تقلیل فرمائی گئی کہ غذا کا انتظام تو بدستور تھا۔ مگر مقدار برائے نام رہ گئی۔ کہ بلا مبالغہ شبانہ روز میں بمشکل دو تولہ غذا ہونے لگی اور بعض دن یہ بھی نہیں۔ اس وجہ سے بھی مقوی ادویات کا صحیح فعل نہیں ہوتا تھا۔ اور ضعف روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ اس قدر نقاہت ہوگئی کہ فرش استراحت سے اٹھنا بھی بغیر خادم کی استعانت کے دشوار ہوگیا۔

چنانچہ شروع ۱۹۰۴ء مطابق ۱۳۲۲ھ ہجری میں جسٹس مسٹر سید شرف الدین جج ہائیکورٹ کلکتہ جب شوق قدمبوسی میں حاضر خدمت ہوئے تو حضور قبلۂ عالم نے ز ور ضعف کی وجہ سے لیٹے ہی لیٹے فرمایا کہ آؤ شرف الدین گلے مل لیں۔

اور جسٹس موصوف بھی چہرۂ اقدس کی ناتوانی دیکھ کر متحیر ہو گئے۔ اور آبدیدہ ہو کر بیساختہ عرض کیا کہ آپ کی صورت زیبا اس قدر کیوں متغیر ہو گئی۔ ارشاد ہوا کہ "تمہارے فراق میں یہ حال ہوا"۔

اسی زمانہ میں کپتان علی محمد خاں صاحب وارثی۔ رسالہ دار۔ رئیس رلائے بریلی حاضر خدمت ہوئے۔ اور بعض دیگر تحائف کے ہمراہ احرام بھی پیش کیا۔ سرکار عالم پناہ نے خادم کو حکم دیا کہ رکھ لو۔ کپتان صاحب موصوف نے دست بستہ ہو کر عرض کیا کہ غلام کی دلی تمنا ہے کہ حضور زیب جسم فرمالیں۔

آپ نے اُٹھنے کا ارادہ کیا۔ مگر ناتوانی مانع ہوئی۔ تو حضور قبلۂ عالم نے لیٹے لیٹے اس احرام کو جسم اقدس سے مس فرما کر خادم کو دے دیا۔ اور کپتان صاحب سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا کہ علی محمد خاں اس وقت نہیں۔ پھر باندھ لیں گے۔

کپتان صاحب یہ شدتِ ضعف دیکھ کر بے چین ہو گئے۔ اور عرض کیا کہ میں ابھی سول سرجن کو لاتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ ڈاکٹر کو نہ لاؤ۔ حکیم عبدالخالق نے جوارش مروارید منگوائی ہے۔ گھبراؤ نہیں اب طبیعت اچھی ہے۔

اس نقاہت و ناتوانی کے قطع نظر۔ جس کو اقتضائے عمر سے تعبیر کریں۔ خواہ شدائد امراض کا نتیجہ کہیں ہر دو حالت میں اس شکایت کو علاج طلب کہہ سکتے ہیں۔ مگر علاوہ اس کے ایک لاعلاج صورت یہ رونما ہو گئی کہ حضور قبلۂ عالم کی وہ قدیم استغراقی حالت جس کو فطرتی کیفیت بھی کہنا خلاف واقعہ نہیں ہے۔ اس میں عمر کے ساتھ ساتھ ترقی ہوئی اور رفتہ رفتہ ۱۹۰۵ء میں یہ عالم ہو گیا کہ جس طرح چھیاسی سال کی عمر کو

طویل عمر کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح آپ کا یہ دوامی استغراق۔ کمال محویت کے درجہ تک پہونچ گیا اور قریب قریب ہمہ وقت آپ کسی گہرے خیال میں محو اور مستغرق رہنے لگے۔

چنانچہ اس دوران سکوت میں اگر آپ کی چشم حق بیں کی حیرت خیز محویت کو دیکھتے تھے تو صاف ظاہر ہوتا تھا کہ شاہد بے نیاز کے کسی کرشمۂ خاص کے نظارہ میں آپ ہمہ تن مصروف ہیں۔

اور اس روحانی اور مستقل کیفیت کی وجہ سے جسمانی عادات۔ اور ظاہری معاملات میں ضروری احکام صادر فرمانا بھی موقوف ہو گیا تھا۔ بلکہ تقسیم تبرکات کے واسطے بھی جب خادم مکرر سکرر اذن طلب ہوتا تھا اس وقت آپ گونہ ہوشیار ہو کر صرف یہ فرماتے تھے کہ دے دو۔

لیکن باوجودیکہ وفور ضعف سے یہ حال کہ بات بھی کرنا دشوار اور استغراق کا یہ عالم کہ بجز ایک ذات کے دوسرے سے سروکار نہیں۔ مگر تبلیغ محبت کی وہی شان کہ بغیر تفریق رنگ و قوم اور بلا امتیاز مذہب و ملت جو شخص۔ جس وقت طالب ہدایت ہوا۔ رہنمائے عالم نے بکمال شفقت اس کی دستگیری فرمائی۔ ایک مرتبہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ شدت نقاہت۔ یا کثرت محویت کی وجہ سے۔ کسی بندۂ خدا کی تلقین کو دوسرے وقت کے لئے ملتوی فرما لیا ہو۔ چنانچہ اس حالت میں بھی ہر روز بکثرت اہل ارادت و عقیدت حاضر خدمت ہوتے اور فائز المرام ہو کر جاتے تھے۔

مرض المفارقت | حتیٰ کہ وہ علالت جس کو مرض المفارقت کے نام سے ہم تعبیر کرتے ہیں اس کی شدت اور صعوبت کا زمانہ بھی۔ سرکار عالم پناہ کے رشد و ہدایت سے خالی نہیں رہا۔ جس نے اپنی ارادت کا اظہار کیا اس کو آپ نے داخل سلسلہ بھی کیا اور اس کے مناسب حال ہدایت بھی فرمائی۔ بلکہ حجاب خلوت میں مستور ہونے سے دس گھنٹہ قبل تک فیضان وارثی کا سرچشمہ جاری رہا۔ اور ہر ایک طالب راہ حق کو آپ نے اسی عنوان سے خلعت فقر اور خطاب شاہی مرحمت فرمایا۔ جس طرح زمانہ صحت

ہیں آپ نقیرنہ تے تھے۔

حضور قبلۂ عالم کی یہ علالت۔ بہ لحاظ اسباب ظاہر۔ زکام وحرارت سے شروع ہوئی اور بالآخر دو ہفتہ کے اندر۔ تپ بلغمی کے پردہ میں نتیجہ وہی ہوا جو ہر ذی روح کو بمصداق "کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ" پیش آتا ہے۔ اس لئے میں نے اپنی ذاتی حیثیت و استعداد کے اعتبار سے اس علامت کو مرض المفارقت اور مقدمۃ الفراق کے نام سے تعبیر کیا۔ جو میرے مبلغ علم کا معیار تھا۔

ورنہ تصانیف ارباب معرفت کی ورق گردانی کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ فی الحقیقت یہ آخری علالت عاشقان صادق کے لئے دعوت المواصلت کا حکم رکھتی ہے۔ ازیں جہت اہل محبت کی اصطلاح میں اس علالت کو مژدۂ تہنیت بھی کہتے ہیں کیونکہ اس علالت کا ماحصل یہ ہے کہ فراق کے ان ناقابل برداشت صدمات کا ہمیشہ کے لئے استیصال ہو جاتا ہے۔ جن کی نسبت عرب کے ایک مؤقر شاعر کا یہ مقولہ ہے کہ

یَوْمُ الْفِرَاقِ مِنَ الْقِیَامَۃِ اَطْوَلُ   وَالْمَوْتُ مِنْ اَلَمِ الْفِرَاقِ اَجْمَلُ

ترجمہ ؎

بڑا ہے روز قیامت سے بھی فراق کا دن   غم فراق سے واللہ موت اچھی ہے

چونکہ اس آخری علالت کے ہاتھوں۔ تعینات کے سنگین حجاب اُٹھتے ہیں اور سالہا سال کے مشتاق دیدار کو۔ انوار جمال یار کا حقیقی نظارہ نصیب ہوتا ہے۔ لہذا اس غیر معمولی یافت کے اعتبار سے محققین ارباب طریقت کا اتفاق ہے کہ محب صادق کے واسطے یہ علالت ظاہری۔ بالمعنی پیغام مواصلت ہے جو بعد اتمام ابتلائے فراق۔ اظہار اعزاز کے لئے بطور خیر مقدم بھیجا جاتا ہے جس کے بعد سرکار شاہ بے نیاز سے۔ اپنے عاشق جانباز کو خلعت حیات جاوید تفویض ہوتا ہے۔ جو درحقیقت عشاق کا گرانقدر امتیاز ہے اور جس کو عرف صوفیہ میں وصل حقیقی یا بقائے کامل کہتے

ہیں۔ غرض عشاق کی علالت آخر ایسے ایسے رموز و اسرار سے معمور ہے۔ جو عوام کے فہم و ادراک سے باہر ہے۔ مولانا روم ؎

من زتن عریاں شدم او از خیال　　　می خرامم تا نہایات الوصال

پس در انحالیکہ مجھ ایسے نابلد راہ طریقت کو علالت عشاق کی باطنی حقیقت و ماہیت سے خبردار ہونا محال ہے۔ تو اب سوائے اس کے کوئی اور چارہ نہیں کہ حضور قبلۂ عالم کی اس علالت کا حال وہی نگارش کروں جو میری ظاہریں آنکھوں نے دیکھا ہے۔

چنانچہ ۱۵ محرم ۱۳۲۳ھ ہجری روز چہارشنبہ۔ مطابق ۲۳ مارچ ۱۹۰۵ء بوقت شب خادم خاص کو حضور قبلۂ عالم کے انفاس پاک میں گونہ ثقالت اور گرفتگی آواز محسوس ہوئی۔ متوجہ ہو کر عرض کیا کہ مزاج عالی کیسا ہے آپ نے حسب عادت فرمایا "اچھا ہے"

صبح کو اضمحلال تو نسبتہً زیادہ تھا۔ مگر دیگر عادات روزمرہ میں کوئی جدید تغیر نہیں پایا سب کو خیال ہوا کہ اس مزید نقاہت کا سبب شاید یہ ہو کہ شب کو غذا بھی گویا نہیں ہوئی۔ قرینہ ہے کہ بعد خاصہ تناول فرمانے کے یہ عارضی ناتوانی رفع ہو جائے۔

اور دوسرے روز بھی مزاج ہمایوں صورتہً بدستور رہا۔ لیکن دن کو غذا کی نسبت یہ فرمایا کہ اشتہا نہیں ہے۔ بلکہ شب کو بھی بہ اصرار مونگ کی کھچڑی کا ایک لقمہ تناول فرما کر پانی پی لیا اور بستر استراحت پر آرام فرمایا۔ جب حسب معمول خادم پاؤں دبانے حاضر ہوا۔ تو دیکھا حرارت کافی ہے اور زکام بھی جاری ہو گیا ہے۔ جس کی وجہ سے آواز بھی گلو گرفتہ ہو گئی ہے۔

شب ہی کو مخصوص خدمت گزاروں کی رائے ہوئی کہ اب باقاعدہ علاج کی ضرورت ہے۔ اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حکیم عبدالخالق صاحب کو بلایا جائے۔ اس لئے کہ علاوہ ذاتی قابلیت کے وہ حضور قبلۂ عالم کے معتقد اور مزاج داں بھی ہیں اور چونکہ ان

کے آنے میں کچھ وقت صرف ہوگا۔ اس واسطے تا آنے اُن کے مولوی فخرالدین احمد صاحب (رئیس دریوئی شریف) جن کو طبابت میں بھی کافی دسترس ہے۔ ان کے مشورہ سے کوئی دوا عارضی طور پر جلد سے جلد دی جائے۔

چنانچہ علی الصباح ایک آدمی حکیم صاحب کو بلانے گدیہ روانہ کیا گیا اور مولوی فخرالدین احمد صاحب سے مزاج کا حال بیان کیا موصوف نے نبض دیکھ کر فرمایا کہ تردد کا محل نہیں ہے معمولی زکام ہے۔ دو روز میں طبیعت بحال ہو جائے گی اور جوشاندہ کا نسخہ لکھ دیا جو فوراً تیار ہوا۔ اور اس کے استعمال سے گو نہ مگر عارضی سکون بھی ہوا۔

سہ پہر کو گدیہ سے آدمی واپس آیا۔ اور معلوم ہوا کہ حکیم صاحب کسی مقدمہ کی پیروی کے لئے لکھنؤ گئے ہیں۔ کل آئیں گے۔ اس دوران میں مولوی صاحب موصوف کا نسخہ تین چار وقت پلایا گیا۔ مگر کوئی فائدہ محسوس نہیں ہوا۔ بلکہ اب وہ حرارت بمنزلہ تپ کے ہو گئی اور زکام حبس ہو گیا۔ اور اکثر الجھن ہونے لگی۔

روز چہارشنبہ ۲۲ محرم ۲۲ محرم کو حکیم عبدالخالق صاحب حاضر خدمت ہوئے اور نبض دیکھ کر تپ نزلاوی کی رعایت سے نسخہ لکھا۔ اور تفریح و تسکین کے واسطے خارجی تدبیریں بھی کیں۔ تخلیخہ بنوایا پاشویہ کرایا۔ شاخیں کھچوائیں۔ اور اسی مناسبت سے دن کو غذا آش جو میں آب انارین ملا کر ہوئی۔ اور شب کے واسطے یخنی۔ بارد ادویات کے ساتھ تغید کرائی۔ لیکن یہ نسخہ ایک شبانہ روز بکمال احتیاط استعمال ہوا۔ مگر کسی شکایت میں تخفیف نہ ہوئی۔

اس عرصہ میں ناسازی مزاج اقدس کی خبر سُن کے قرب وجوار کے عام ارادتمندوں کے علاوہ بعض تعلقدار جن کا مخصوص جاں نثاروں میں شمار تھا آ گئے۔ اور دور دور کے اکثر ممتاز اور باوقار خدمت گزاروں کا بھی در دولت پر ہجوم ہو گیا۔ سب نے مزاج اقدس کی حالت دیکھ کر متفقہ طور پر یہ رائے قائم کی کہ حکیم عبدالحی صاحب رئیس قصبہ ہونہ

کا علاج ہونا چاہیے۔

چنانچہ فوراً ایک آدمی روانہ ہوا۔ اور بعد عصر حکیم صاحب موصوف آگئے اسی وقت نبض دیکھی اور باہر آکر قبض اور حبس زکام کے خیال سے یہ نسخہ لکھا۔ رب السوس ۔ شکر تیغال مغز ہیدانہ - صمغ عربی - آرد تخم باقلا - شیر خشت - باآب انارین سائیدہ قدرے قدرے پلینید جس کو فوراً خود ہی تیار کیا اور چند مرتبہ استعمال کرایا۔ فائدہ یہ محسوس ہوا کہ تمام شب سکون رہا بلغم بآسانی خارج ہوا اور ایک اجابت بھی ہوئی۔

صبح کو حکیم صاحب نے ایک نسخہ مشروبہ - اور ایک شربت بزوری معتدل کا لکھا اور دونوں فوراً تیار کیے جن کی پہلی خوراک پینے سے شدائد مرض میں تخفیف معلوم ہوئی - دوپہر کو پاشویہ کرایا۔ جس سے تپ بھی بہت کم ہو گئی۔ لیکن ضعف جو بجائے خود ایک مخدوش شکایت تھی۔ اس کے لئے موصوف نے ایک جوارش تیار کی جس میں تخم گاؤزبان اور مروارید ناسفتہ بھی تھے جو بہت مفید ہوئی۔

غرض حکیم صاحب کی صحیح تشخیص اور سریع الاثر علاج کو دیکھ کر ہر شخص نے موصوف کی حذاقت کا اعتراف کیا۔ اور غلامان وارثی ممدوح کے شکر گزار ہوئے۔

لیکن مشیت حضرت رب العزت کچھ اور تھی اور جس کا اظہار مسبب الاسباب نے اس پردہ میں فرمایا کہ جس وقت حکیم عبد الحی صاحب کو بلانے آدمی گیا تھا - اس وقت بعض حضرات نے ایک شخص کو لکھنؤ روانہ کیا کہ حکیم عبد الحفیظ صاحب کو لاؤ اگر اتفاق سے وہ نہیں آسکے تو حالت اضطرار میں دوسرا آدمی حکیم عبد العزیز صاحب کو لانے کے لئے بھیجا گیا - جو ۲۵ر محرم آٹھ بجے شب کو معہ حکیم صاحب کے آیا - اور اسی وقت سے حکیم عبد العزیز صاحب کا علاج شروع ہو گیا اور حکیم عبد الحی صاحب واپس گئے

اس میں شک نہیں کہ حکیم عبد العزیز صاحب اپنے وقت میں طبیب حاذق تھے - اور اس سربرآوردہ حکیم نے سرکار عالم پناہ کا علاج بہت غور سے کیا۔ رات اور دن

میں کم سے کم دس مرتبہ نبض دیکھی۔ متواتر نسخے لکھے اور ہر قسم کی تدبیریں کیں۔ مگر اتفاق ہے کہ کسی شکایت میں افاقہ نہیں ہوا۔ بلکہ ضعف زیادہ ہوگیا

حالانکہ حضور قبلۂ عالم کی یہ علالت بادی النظر میں معمولی علالت تھی کہ ایام تدامل میں زکام ہونا۔ اور اس کے سبب سے تپ کا آجانا۔ زیادہ اہمیت میں شمار نہیں کیا جاتا جس کا علاج ہر طبیب بآسانی کرتا ہے۔ مگر بعض واقعات ایسے بھی حالات وقوع پذیر ہوئے جن کے معائنہ کے بعد یہ کہنا بے محل نہیں معلوم ہوتا کہ سرکار عالم پناہ کی یہ آخری بیماری بھی غیر معمولی رموز سے خالی نہ تھی۔

جس کے لئے یہی ایک دلیل کافی معلوم ہوتی ہے کہ ایسے ایسے قابل اور کہنہ مشق اطبا کو مرض کے حقیقی اسباب اور کیفیات کی تشخیص میں پوری کامیابی نہیں ہوئی۔ کیونکہ مسلمہ ہے کہ ظاہری انتظامات کا۔ باطنی معاملات پر غالب آنا قطعی محالات سے ہے۔

اس واسطے میرا نظریہ ہے کہ معالجین سے علاج میں کوئی لغزش نہیں ہوئی۔ اگرچہ بدیہیات سے ہے کہ ان کے مجوزہ ادویات کا فعل موثر ثابت نہیں ہوا۔ تاہم یہ ان کی حذاقت کا قطعی نقص نہ تھا۔ بلکہ بظاہر جناب والا کو حبس زکام کی وجہ سے جو تپ لاحق ہوگئی تھی۔ اس کے بعض خصائص پر غور کرنے سے یقین ہوتا ہے کہ اس تپ کو حضور قبلۂ عالم کے باطنی جذبات وکیفیات سے گہرا تعلق تھا۔ کیونکہ اس کے اثرات بھی ایسے عجیب بلکہ عجیب تر نمایاں ہوئے جن کو دیکھ کر معالج بھی متحیر تھے۔

مثلاً اس علالت میں جناب والا کی نبض کا حیرت خیز کرشمہ یہ تھا کہ بعض اوقات اس قدر ضعیف اور غیر منتظم ہوتی تھی کہ نباض بالکل مایوس ہوجاتا تھا اور کسی وقت جوان اور تندرست شخص کی نبض سے زیادہ قوی اور منتظم معلوم ہوتی تھی۔ اور یہ تغیر دس منٹ کے بعد ہوتا تھا۔

بلکہ نبض کی اسی مخصوص کیفیت کا ذکر حکیم عبد العزیز صاحب نے بایں الفاظ فرمایا

تھا کہ ابھی تک مجھ کو نبض کے ذریعے سے یہ اطمینان نہیں ہوا کہ علاج کس اصول پر کیا جائے کیونکہ دن میں بھی اور رات کو بھی تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد نبض دیکھی۔ مگر ہر مرتبہ صورت مختلف اور نوعیت جداگانہ محسوس ہوئی کبھی ازحد ضعیف اور کبھی رفتار اور انتظام میں معمول سے زیادہ قوی اور صحیح پایا۔ لہٰذا ایسی حالت میں مرض کی حقیقی ماہیت سے خبردار ہونا میرے خیال میں دشوار ہے کیونکہ مزاج کی کیفیت دریافت کرنے کا بڑا ذریعہ نبض ہے۔ اور نبض میں "گاہے چنیں۔ گاہے چناں" کا مضمون ہے۔ اس لئے جو تدبیر تجویز کی جاتی ہے وہ بے سود ثابت ہوتی ہے!

علیٰ ہٰذا۔ حکیم سلطان محمود صاحب متوطن اٹاوہ جن کا علاج حکیم عبدالعزیز صاحب کے علاج کے بعد ایک روز ہوا۔ فرماتے تھے کہ میں نے جس وقت۔ پہلی مرتبہ نبض دیکھی۔ تو نہایت قوی اور منتظم معلوم ہوئی۔ خیال ہوا کہ طبیعت علاج پذیر ہے۔ ازالۂ تپ اور اخراج بلغم کے لئے کوشش کرد۔ مگر بعد دوا پلانے کے نبض دیکھی تو ضعف کا وہ عالم پایا جو حالت دم واپسیں ہوتی ہے۔ اسی وقت میں نے اپنی تجویز کو خود غلط کہا۔ اور یقین ہو گیا کہ سرکار عالم پناہ کے ازالۂ مرض کے لئے میں نسخہ نہیں لکھ سکتا۔

اور اس انتشار نبض کا یہ بھی ایک مخصوص ضمیمہ تھا کہ بخار کبھی خفیف اور کبھی زیادہ محسوس ہوتا تھا۔ چنانچہ ایسا بھی ہوا کہ اتفاق سے دو طبیب بیک وقت حاضر خدمت ہوئے، ایک نے نبض دیکھ کر یہ تجویز کیا کہ خاموشی جو بصورت غشی آپ لوگ دیکھتے ہیں۔ یہ شدت تپ کی وجہ سے ہے۔ اور پانچ منٹ کے بعد دوسرے طبیب نے نبض دیکھی تو یہ کہا کہ بخار۔ تو نہیں مگر حرارت ضرور ہے اور غفلت کا سبب کثرت ضعف ہے۔

حکیم مرزا یعقوب بیگ صاحب دارثی۔ جن کا حضور قبلۂ عالم کے قدیم اور جاں نثار غلاموں میں شمار تھا۔ شاید ۲۲ یا ۲۳ محرم کو دربھنگہ سے آگئے تھے۔ اُن کا حالت اضطرار میں یہ عالم تھا کہ حکماء کے مشورہ میں بھی شریک ہوتے تھے اور دواساز کو مزید احتیاط کی ہدایت بھی کرتے

تھے۔ مگر زیادہ خدمت اقدس میں حاضر رہتے اور تھرمامیٹر لگا کر حرارت کا اندازہ کرتے تھے۔ اور ایک مرتبہ حاضرین سے مخاطب ہو کر کبھی کہتے کہ سو ڈگری کا بخار ہے۔ اور کبھی فرماتے کہ ایک سو چار تک پہنچ گیا ہے۔ ایک مرتبہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ گھنٹہ بھر تک بخار یکساں رہا ہو۔

علیٰ ہذا، حضور قبلۂ عالم کی گلوگرفتہ آواز۔ و نیز کثرت ضعف میں بھی ایسے ہی تعجب خیز تغیرات رونما ہوئے ہیں جن کو دیکھ کر بجز اس کے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ باطنی جذبات کے غیر معمولی اثرات تھے۔

چنانچہ اس کی صراحت کہ وفور ضعف سے کیا حالت تھی اس لئے بے ضرورت ہے کہ دوران علالت میں جس قدر اہل ارادت و عقیدت شرف زیارت سے مشرف ہوئے ہیں۔ ان کو بخوبی اس کا علم ہے کہ سرکار عالم پناہ کی پہلی ناتوانی میں۔ شدائد مرض کے باعث جس نقاہت کا اضافہ ہو جانے سے محرم ۱۳۲۳ھ ہجری کے آخر ہفتہ میں کثرت ضعف کا یہ عالم ہوا کہ جب خادم مکرر عرض کرتا تھا کہ پانی نوش فرمایئے گا۔ اور آپ کو ہاں یا نہیں کہنے میں جو تھوڑا وقفہ ہوتا تھا۔ وہ توقف زبان حال سے شاہد تھا کہ قبلۂ عالم کو فرط ناتوانی سے بات بھی کرنے میں تامل ہوتا تھا۔

یا کوئی ارادتمند رخصت طلب ہوتا تھا۔ تو آپ ایسی ضعیف آواز میں فرماتے تھے کہ "اچھا جاؤ" جس کو قریب بیٹھے ہوئے بعض خدام سنتے تھے اور بعض دوسروں سے پوچھتے تھے کہ کیا حکم صادر ہوا۔

روز سہ شنبہ ۲۸ محرم ۱۳۲۳ھ | اسی نازک حالت میں۔ ۲۸ محرم کو ایک ادنیٰ طبقہ کی معمر عورت نے۔ جو بہ نظر عیادت حاضر ہوئی تھی خدام کو درد دستی میں مضطرب اور پریشان دیکھ کر بے ساختہ۔ ایسے پردرد لہجہ میں کہا کہ "میاں صاحب! ابتو اچھے ہو جاؤ" کہ تمام حاضرین بکیف ہوگئے۔ اور سرکار عالم پناہ نے اس طرح سر اٹھا کر محبت کی نظر سے اس کو دیکھا جس طرح حالت صحت میں اکثر اپنے غلاموں کو آپ دیکھتے تھے۔ اور بکمال شفقت۔ اتنی بلند آواز سے فرمایا

"گھبراؤ نہیں - ہم اچھے ہیں" کہ باوجود اس کے کہ آٹھ دس قدم کے فاصلہ پر وہ کھڑی تھی مگر اس نے اپنے مہربان آقا کا یہ پردرد آمیز ارشاد بخوبی سن لیا - اور وہیں سے بلائیں لیکر اشکبار واپس گئی۔

یہ واقعہ اہم اور عجیب اس وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس حالت میں سرکار عالم پناہ کو دنور ضعف کے باعث - بہ اقتضائے بشریت - زبان مبارک سے ہاں یا نہیں کہنا بھی دشواری سے خالی نہ تھا وہ نقاہت ایک آن واحد میں تقویت اور توانائی سے مبدل ہو گئی - اور وہ گلوگرفتہ آواز - جو قریب تر بیٹھنے والوں کو اکثر سنائی نہیں دیتی تھی وہ اس قدر صاف اور بلند ہو گئی کہ آپ کا ارشاد دس قدم کے فاصلے سے ایک ضعیفہ نے بخوبی سن لیا -

اور بعدہٗ اس غیر معمولی تقویت کا عجیب تر کرشمہ یہ دیکھا کہ تقریباً پانچ منٹ تک آواز صاف اور توانا رہی - اس عرصہ میں آپ نے باتیں بھی کیں - ایک طالب سے بکمال صراحت شرائط بیعت کا اقرار لے کر داخل سلسلہ بھی فرمایا۔ اور یہ ہدایت بھی کی کہ "جھوٹ نہ بولنا" پھر کیفیت نیم خوابی طاری ہونے لگی۔ حکیم مرزا یعقوب بیگ صاحب وارثی نے نبض دیکھی تو ضعف کی وہی صورت نظر آئی۔ جو قبل اس واقعہ کے تھی۔

حالانکہ یہ واقعہ بادی النظر میں بالکل سادہ ہے لیکن درحقیقت بعض اختصاص محبت سے معمور ضرور ہے۔ مثلاً وہ ضعیفہ حضور قبلۂ عالم کی دامن گرفتہ بھی تھی یا نہ تھی اس کا تو علم نہیں مگر اس کے اس پردرد جملہ سے کہ "میاں صاحب اب تو اچھے ہو جاؤ" صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے دل کو محبت وارثی سے گہرا سروکار تھا۔ جس کی آواز نے علاوہ حاضرین کے خود بدولت کو بے چین کر دیا۔ اور "ہر چہ از دل خیزد۔ بر دل ریزد" کا مضمون پیش آیا کہ جس طرح اس ضعیفہ نے بہ اقتضائے محبت اپنے آقائے نامدار کے شدائد مرض اور افراط ضعف کو دیکھ کر حالت اضطراری میں اپنی دلی خواہش کا اظہار کر دیا کہ میاں صاحب اب تو اچھے ہو جاؤ۔ اسی طرح ہمارے بندہ نواز رہنمانے - اپنی عاشق زار ضعیفہ کی تشفی فرمائی۔ اور فرط شفقت سے

ارشاد ہوا کہ گھبراؤ نہیں ہم اچھے ہیں۔

غرض حضور قبلۂ عالم کے فرط ضعف اور گرفتگی آواز ارشاد نپ ہیں۔ بلا کسی تحریک کے دفعتاً ایسے بدیہی تغیرات کا ظاہر ہونا دیکھ کر اگر کوئی آپ کی اس علالت کو مشترک بہ رموز و اسرار سمجھے۔ تو شاید اس کو غلط فہمی یا اقتضائے عقیدت نہ کہا جائے گا۔

بلکہ یہی سبب تھا کہ فن طب کے ماہر جید حکیم عبدالعزیز صاحب نے نبض کے غیر معمولی طرز اور عنوان کو دوسرے الفاظ میں شان اجتماع ضدین سے تعبیر کیا۔ اور ایسی حالت میں مرض و مریض کی حقیقی نوعیت و ماہیت سمجھنے میں اس طرح دشواری ظاہر فرمائی جس کا مفہوم ایک معنی میں مجبوری اور مایوسی کا بھی مرادف ہو سکتا ہے

اور غلامان بارگاہِ وارثی کو اس تین دن کے علاج میں اس کا بھی تجربہ ہو چکا تھا کہ باوجود مختلف تدابیر کے عارضی اور وقتی سکون بھی نہیں ہوا۔ اس لئے خادم خاص نے کچھ تبرکات دے کر حکیم صاحب موصوف کو شکریہ کے ساتھ رخصت کر دیا۔

اب قریب قریب جملہ ارادتمندوں کو یہ خیال ہوا کہ حکیم عبدالحی صاحب کے علاج سے ہر شکایت میں نسبتًہ افاقہ ضرور ہوا تھا۔ لہذا جس طرح ممکن ہو پھر انہیں کو بلاؤ اور اس کے لئے کوئی مقتدر شخص جائے۔ تاکہ وہ کوئی عذر نہ کر سکیں۔ چنانچہ سب نے اس خدمت کے لئے منشی عبدالرؤف صاحب وارثی رئیس دیوی شریف کو منتخب کیا اور قریب مغرب موصوف الصدر حکیم صاحب کو لانے کے واسطے ہونہ تشریف لے گئے۔

روز چہار شنبہ ۲۹ محرم ۱۳۲۳ھ | ۲۹ محرم روز چہار شنبہ کو علی الصباح حکیم سلطان محمود صاحب متوطن اٹاوہ نے۔ جو دو روز سے بہ نظر عیادت حاضر خدمت تھے نبض دیکھی۔ اور ادویات مشروبہ میں کچھ ترمیم فرمائی۔ اور کہا کہ حکیم عبدالحی صاحب آتے ہیں اگر ان کی رائے ہوئی اور زیادہ قرینہ ہے کہ وہ میرے ہم خیال ہوں گے تو سہ پہر کے واسطے دوسرا نسخہ لکھوں گا جس سے تفریح بھی ہوگی اور بلغم بھی بہ آسانی خارج ہوگا۔

لیکن خلاف امید اس روز صبح ہی سے حضور قبلۂ عالم کی طبیعت بشاش تھی۔ بخار قطعی نہ تھا۔ آواز بھی صاف تھی۔ اجابت بھی ہوئی۔ حسب عادت متبسم لبوں سے باتیں بھی کیں بعض ارادتمندوں سے معانقہ بھی کیا۔ مگر لیٹے لیٹے۔ اکثر مریدین کو ان کے مناسب حال ہدایتیں بھی کیں۔ کسی کو شیرینی۔ کسی کو ملبوس خاص دینے کا خادم کو حکم فرمایا۔ قریب دس بجے آش جو جس میں مفرح اور مقوی اجزا بھی شریک تھے۔ قلیل مقدار میں نوش فرمایا۔ جس نے مزاج پرسی کی اس سے یہی ارشاد ہوا کہ "ہم اچھے ہیں۔ یہی لوگ (خدام کی طرف اشارہ کرکے) کہتے ہیں کہ بیمار ہو۔"

یہ امید افزا صورت دیکھ کر غلامان وارثی خوش ہو گئے۔ کسی نے بذریعہ خط دوسروں کو مطلع کیا کہ سرکار کی طبیعت روبہ صحت ہے۔ کسی نے اپنے مکان پر تار دیا کہ آج افاقہ رونما ہوا۔ کوئی نقد۔ کوئی غلہ خیرات کرنے لگا۔ کسی نے قربانی کی۔ کسی نے جوش مسرت میں بطور شکرانہ میلاد کیا۔ اور حاضرین آستانۂ اقدس کی دعوت کی۔ اور مساکین کو کھانا تقسیم کیا۔ جس کی یادگار میں آج تک پنڈت دیندار شاہ صاحب وارثی ہر سال بقید دن آستانۂ اقدس پر میلاد اور زائرین کی دعوت بکمال اہتمام کرتے ہیں۔

اس علالت میں ابتدا سے خدام یہ اہتمام بھی کرتے تھے کہ طالبین ہدایت کو خدمت عالیہ میں اس وقت پیش کرتے تھے۔ جس وقت گونہ سکون ہوتا تھا۔ ورنہ اس خیال سے روکتے تھے کہ ایسی نازک حالت میں تھوڑے تکان سے بھی زیادہ نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے۔ آج وہ انتظام بھی اٹھا دیا گیا۔ جس وقت جس نے اپنی ارادت کا اظہار کیا۔ اسی وقت شرف بیعت سے مشرف کرا دیا۔ چنانچہ تمام دن یہ سلسلہ جاری رہا۔ کہ متعدد اہل ارادت حاضر خدمت ہوئے۔ اور حضور قبلۂ عالم نے داخل بیعت فرمایا۔

ظہر کے بعد حکیم عبدالحی صاحب بھی آ گئے۔ اور حاضر خدمت ہو کر نبض دیکھی۔ طبیعت کو بحال پایا تو حاضرین سے مخاطب ہو کر نہایت مسرت آمیز لہجہ میں کہا کہ آپ حضرات کو

ظلِ حمایتِ وارثی میں پناہ گزیں رہنا مبارک ہو۔ اس وقت آپ کے آقائے نامدار کا مزاجِ اقدس بہت اچھا ہے۔ اگر آج شب کو بھی تپ کا دورہ نہ ہوا۔ تو کل جناب حضرت کو تندرست دیکھئے گا۔ اور حکیم سلطان محمود صاحب سے کہا کہ آپ کی رائے صائب ہے۔ دوسرا نسخہ ضرور لکھا جائے۔ چنانچہ دونوں طبیب باہر آئے اور دیگر موجودہ اطباء کو بھی شریکِ مشورہ کیا اور نسخہ لکھا گیا جو فوراً تیار ہوا۔ اور پانچ بجے حضور نے نوش فرمایا اور شب کی غذا کے واسطے یہ تجویز ہوا کہ بجائے یخنی کے آش جو مشتمل بہ اجزائے مقوی دینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اسی اثناء میں یہ سُنا کہ وزیرستان کا باشندہ ایک طالبِ راہِ حق در دولت پر کھڑا ہے خادم بارگاہ نے کہا۔ بلالو۔ جب وہ اندر آئے تو سب نے پہچانا کہ نادرخاں وارثی ہیں جو قبل ازیں لباس فقر کے خواستگار آئے تھے۔ مگر اس وقت شرف بیعت سے مشرف ہو کر چلے گئے تھے۔ شاید حسب ہدایت مدت سہ سالہ گزار کر آج پھر اسی شوق میں حاضر خدمت ہوئے ہیں۔

چنانچہ حاجی فیضو شاہ صاحب نے اس گرفتار دام محبت کو پیش کرنے کے وقت یہی عرض کیا کہ حضور علی مسجد کے قریب رہنے والے خاں صاحب آئے ہیں جن سے آپ نے وعدہ فرمایا تھا کہ تین سال کے بعد آنا۔ تم کو فقیر بنا دیں گے

حضور قبلہ عالم گو وفور ضعف سے خاموش یا حالتِ محویت میں ہمہ تن مصروف تھے مگر چونکہ ہدایت خلق ہر حال میں منظور تھی۔ خادم خاص کی یہ گزارش سُن کے رہنمائے عالم نے فرمایا "اچھا" اور باوجود فرط ناتوانی کے فرشِ استراحت سے بہ استعانت خادم اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ مگر تھوڑے غور و خوض کے بعد پھر لیٹ گئے اور یہ ارشاد فرما کر خاں صاحب موصوف کو رخصت کر دیا کہ "جاؤ۔ آج نہیں۔ کل آنا" اور دیگر متمنی بیعت جو حاضر تھے ان کو بکمال شفقت داخل سلسلہ فرمایا۔

۹ بجے شب کو اطبا کی رائے سے۔ خادم نے جب کاسۂ آش جو پیش کیا تو پہلے سرکار عالم پناہ نے اس عنوان سے تامل فرمایا۔ جس سے عدم رغبت کے آثار نمودار ہوئے لیکن بعدۂ ارادتمندوں کے اصرار سے آپ نے دو چار چمچے نوش فرما کر بستر راحت پر استراحت فرمائی۔ مگر افسوس۔ ہم ظاہر بینوں کو یہ خبر نہ تھی کہ اغذیۂ دنیوی میں سے ہمارے بندہ نواز آقا کی یہ آخری غذا ہے۔

چنانچہ دس بجے رات کو پہلے پائے مبارک سرد محسوس ہوئے۔ اور پانچ منٹ کے بعد روزانہ سے زیادہ شدید تپ آئی۔ گو اطبا نے خارجی تدبیریں کیں۔ مگر تمام رات بخار بدستور رہا۔ جس کی وجہ سے تاسحر الجھن اور تشنج کی تکلیف رہی۔

روز پنجشنبہ ۳۰ محرم ۱۳۲۳ھ ۳۰ محرم بروز پنجشنبہ بعد نماز صبح ہر دو معالج و نیز دیگر موجودہ اطبا نے عرصہ تک باہم مشورہ کیا۔ اور ہر نسخہ کے ایک ایک جزو پر اصولی بحث ہوتی رہی۔ آخر باتفاق رائے ادویات مشروبہ میں کافی ترمیم ہوئی۔ تیر وطی کی بھی صورت بدل دی اور بعض دیگر تدابیر سے بھی رفع شکایات کی کوشش کی۔ مگر شدائد مرض میں افاقہ نہ ہوا۔ حتیٰ کہ دوا پینے کے بعد جو عارضی تفریح ہو جاتی تھی آج وہ بھی نہ ہوئی۔

چنانچہ مزاج ہمایوں کا یہ حال دیکھ کر مجھ ایسے اہل ظواہر کو استعجاب تھا کہ دوا کا فعل صحیح کیوں نہیں ہوتا۔ لیکن ہمارا یہ عامیانہ خیال اس وقت رفع ہو گیا جب سوا گھنٹہ کے بعد اس مشیت خداوندی کا حقیقی مضمون ہماری آنکھوں کے سامنے ظاہر ہو گیا۔ اس وقت یہ سمجھ میں آیا کہ درحقیقت اس علالت کے پردہ میں مشاہد بے نیاز اپنے عاشق جانباز کو بوساطت کثرت سے فضلائے تربت میں بلانا چاہتا تھا۔ اور اطبا خلاف منشار حضرت رب العزت کوشش کرتے تھے۔ اس لئے اس قادر مطلق نے بفحوائے "اِنَّهٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ" ادویات کے مفاد و اثرات ایسے معطل کر دیئے کہ معالجین کے جملہ اذکار بے سود اور بیکار ثابت ہوتے تھے۔

چنانچہ عاشقان جانباز کا جس طرح حالت صحت میں منشائے الٰہی کے سامنے سرنگوں

رہنا نصب العین ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ اہل حقیقت۔ سخت سے سخت علالت میں بھی برضائے حضرت احدیت رہتے ہیں۔ اور اپنے جانگداز درد کو عطیہ شاہد بے نیاز ہونے کی وجہ سے عین دوا سمجھتے ہیں۔ لیکن بہ لحاظِ انتظام عالمِ اسباب یہ بھی اختیار کرنا ہوتا ہے کہ طبیب جو دوا تجویز کرتا ہے اس کو لاشی اور بیکار سمجھنے کے بعد بھی استعمال کرنے سے انکار نہیں فرماتے ہیں۔ اور ان کے اس طریقِ عمل سے انکار نہیں فرماتے ہیں۔ اور ان کے اس طریق عمل سے دوا کا استعمال کرنا ایک نوع سے ہادیان دین وملت کی متفقہ اور مخصوص سُنّت سمجھا جاتا ہے۔

اسی اعتبار سے حضور قبلۂ عالم نے عوارض کے نام۔ یا اُن کی صحیح علامت یا اُن کی وجہ سے جو تکلیف واذیت تھی۔ باوجود اصرار اطبا کے اس کا اظہار نہیں فرمایا۔ مگر دوا کے استعمال سے انکار بھی نہیں کیا۔ حالانکہ کوئی علاج مفید نہیں ثابت ہوا۔ لیکن اطبا ہمیشہ سرگرم کوشش رہے اور سکون کے واسطے انواع انواع طریقہ سے تدبیریں کیں۔ حتیٰ کہ ایک مرکب روغن تیار کیا جس کو صدر پر مالش کرنے سے بے فائدہ مگر عارضی رونما بھی ہوا۔ کہ قدرے بلغم بآسانی خارج ہوا اور نسبتاً آواز کی گرانی میں کچھ عرصہ تک تخفیف محسوس ہوئی۔

لیکن شب ہی سے یہ پریشان کن خبر مشتہر ہو چکی تھی کہ آج ہمارے بندہ نواز رہنما کا مزاج ہمایوں زیادہ ناساز ہے۔ جس کو سُن کے قرب وجوار کے متعدد عقیدت شعار بہ نظر عیادت صبح ہی سے جمع ہو چکے تھے۔ اور مزید برآں یہ بھی افواہًا مشہور ہو رہا تھا کہ سرکار عالم پناہ نے پردہ فرمایا۔ اس جہت سے دُور دُور کے غلامان بکثرت حاضر ہو گئے تھے۔ چنانچہ اس روز مریدین اور غیر مریدین کا اجتماع اس قدر ہو گیا تھا کہ در دولت پر کھڑے ہونے کی گنجائش نہ تھی۔ اور اندازاً یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس مجمع کثیر میں باعتبار مشتاقین زیارت کے طالبین ہدایت وبیعت کا ہجوم زیادہ تھا۔

کیونکہ تمام دن چشمۂ فیضان وارثی جاری رہا۔ اور اسی حالت ضعف میں سرکار عالم پناہ

بکمال شفقت رشد و ہدایت میں مصروف رہے۔ اور بکثرت طالبین کو داخل سلسلہ فرمایا۔

اسی دوران میں نانک شاہی خاندان کے ایک سن رسیدہ درویش نے حاضر خدمت ہوکر حسن عقیدت سے طالب ہونے کی استدعا کی اور حسن عنایت سے حضور نے ان کو اپنے ظل حمایت میں لیا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مسافر جریدہ۔ راہ حق کا تلاشی۔ اور کسی برگزیدہ خدا کا فرستادہ تھا۔

اس واسطے کہ حضور قبلۂ عالم نے دیکھ کر بیساختہ فرمایا کہ تم آگئے۔ بیٹھو۔ اوسی فرط ضعف میں استغفار پڑھا کر ان کو مرید کیا اور اسی وقت خلعت فقر عطا ہوا اور رسول شاہ کا ممتاز خطاب مرحمت فرماکر یہ ارشاد ہوا کہ " جاؤ رضائے خدا پر ثابت قدم رہنا۔ مر جانا۔ مگر ہاتھ نہ پھیلانا"۔

مگر چند ساعت کی یہ تکان بھی بہ سبب نقاہت برداشت نہ ہوئی۔ کیونکہ رسول شاہ کو رخصت فرماکر ہنوز آرام نہیں فرمایا تھا کہ دفعتاً تپ میں کچھ ترقی ہوئی اور بصورت غشی۔ خاموشی کا عالم طاری ہوگیا اور رفتہ رفتہ شدائد تپ کے اثرات سے اُلجھن شروع ہوگئی۔ اطبا نے کف پا کی مالش کرائی۔ فوراً لخلخہ تیار کیا۔ دماغ پر روغن گل کا پھایا رکھا مگر کسی تدبیر سے آپ کی بے چینی میں تخفیف نہیں ہوئی اور اسی حالت میں آقائے نامدار نے اپنے غلاموں کو نہایت شفقت کی نظر سے دیکھا۔ سب کو خیال ہوا کہ کچھ فرمانا منظور ہے۔ لیکن اس وقت آپ خاموش رہے۔ اور تھوڑے عرصے کے بعد ایک دیرینہ غلام سے مخاطب ہوکر نہایت ضعیف اور گلوگرفتہ آواز سے فرمایا " کے بجے ہیں "۔ اس نے برجستہ عرض کیا۔ کہ مولائے من تین بج گئے ہیں۔ حضور قبلۂ عالم نے۔ پہلے ایسے دو جملے۔ جن کو بطور تنبیہ ایک مخصوص ارادتمند سے تعلق تھا۔ فرمائے۔ بعدۂ نہایت پرجوش لہجہ میں۔ جس سے حالت انتظاریہ نمایاں ہوتی تھی۔ ارشاد ہوا کہ " ابھی بہت دیر ہے۔ شکی گھوڑے کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ بہلی آگئی ہے۔ چار بجے سوار ہوں گے"۔

اس فرمان وارثی کے الفاظ - بظاہر غیر مسلسل اور غیر مربوط - اور تشریح طلب سُن کے اکثر حاضرین ساکت اور متحیر ہو گئے - مگر بعض مخصوص ارادتمندوں نے تاویلاً غور کیا تو اُن کو پریشان کن خیال ہوا کہ مشکی گھوڑے سے شب تاریک مراد ہے - تو اس کا سلسلہ شاید اب قریب اختتام ہے کہ ٹانگ ٹوٹ گئی - اور پہلی سواری سفر کی ہے - وہ آ گئی جس سے اشارہ ہے کہ سفر دار القرار کے واسطے سامان تیار ہے - اور روانگی کے واسطے چار بجے کا وقت پسند فرمایا ہے -

غرض اس ارشاد کی تشریح اور تاویل سے عموماً غلامان بارگاہ وارثی افسردہ اور پریشان ہوئے - کیونکہ ہر شخص دیکھ رہا تھا کہ حضور قبلۂ عالم کی صحت میں بجائے یوماً فیوماً کے اب ہر ساعت اور ہر آن میں تنزل اور انحطاط کی شان نمایاں ہو گئی ہے - جس کا نتیجہ عنقریب وہی ہوتا نظر آتا ہے جو اس ارشاد کی تاویل کی ہے -

اسی عرصہ میں نادر خاں وزیرستانی جن کے حق میں کل حضور قبلۂ عالم نے آج کی حاضری کے واسطے حکم صادر فرمایا تھا - وہ قدمبوس ہو کر سامنے آئے اور حسب دستور حاجی تیغو شاہ صاحب نے ان کو پیش کیا تو باوجود افراط ضعف اور شدائد مرض کی ناقابل برداشت تکلیف کے سرکار عالم پناہ نے مثل یوم گزشتہ - آج لباس فقر تفویض کرنے میں شاید اس وجہ سے تامل نہیں فرمایا کہ از روئے حساب انتظار کی مدت سہ سالہ گزشتہ شب کو ختم ہو گئی اور آج چوتھے سال کا پہلا دن تھا - اس لئے حسب وعدہ رہنمائے کامل نے اپنے حلقہ بگوش کو وادی عشق کی سیاحت کے لئے اپنے دربار کی مخصوص وردی تفویض فرما کر فقیر شاہ کا خطاب مرحمت فرمایا - اور بصراحت سمجھا دیا کہ مشربی دستور العمل کا خلاصہ یہ ہے کہ "راہ محبت میں اگر ابتلائیں پیش آئے تو اس کو شاہد بے نیاز کی عنایت سمجھے اور ماسوا اللہ سے سروکار نہ رکھے - جاؤ" اور اس تقریر کے بعد - وفور ضعف سے آپ اور زیادہ ساکت اور خاموش ہو گئے -

حضور قبلۂ عالم کا یہ حلقہ بگوش - سلسلۂ فقر میں آخری تہبند پوش تھا جو قدمبوس ہو کر بارگاہ وارثی سے رخصت ہوا - تو مکان سے باہر جاتے سب نے دیکھا - لیکن دردوست

پر جو خدمت گزار موجود تھے ان کو اس کا علم بھی نہیں ہوا کہ وہ نو گرفتار دام محبت باہر کب آیا۔ اور کس طرف خدا کے بھروسے پر چلا گیا حتیٰ کہ آج تک اس مفقود الخبر کا حال اس قدر بھی نہیں معلوم ہوا کہ وہ سلسلہ وارثیہ کا جانباز فقیر ہنوز بقید حیات ہے یا راہ مطلوب میں جاں بحق تسلیم ہوا۔

بلکہ نادر خاں ملقب بہ فقیر شاہ کی تہبند پوشی کے بعد۔ جس طرح آقائے نامدار کے دست حق پرست سے کوئی حق پرست فقیر تہبند پوش نہیں ہوا۔ اسی طرح ہمارے شفیق معلم نے تعلیماً بھی کوئی جدید حکم نہیں صادر فرمایا۔ جس کو دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ رشد و ہدایت کا دروازہ بند ہو گیا۔ گو بالمعنی فیضان وارثی بدستور جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ مگر ہم ظاہر بینوں کی آنکھ تصرفات وارثی کے جو کرشمے دیکھتی تھی وہ دکھائی نہیں دیتے اور ہمارے کان جو رشد و ہدایت کے وقت اس داعی الی اللہ کی آواز سنتے تھے وہ سنائی نہیں دیتی۔

ذکر وصال خلاصہ یہ کہ فقیر شاہ صاحب کی تہبند پوشی کے وقت۔ جناب حضرت کا چند ساعت کے لئے ان کی جانب متوجہ ہونا۔ اور مختصر الفاظ میں ہدایت فرمانا۔ آپ کے ناساز مزاج کیلئے اس قدر مضر ہوا کہ طبیعت اور زیادہ مضمحل ہو گئی۔ اور اس مرتبہ حضور قبلۂ عالم نے بہ اسباب ظاہر افراط ضعف سے بصورت غشی سکوت فرمایا کہ اکثر خدام خاص کی مکرر عرض داشت پر بھی التفات نہ ہوا۔ اور ان کی گذارش کے جواب میں صرف ہاں یا نہیں کہنا بھی گوارا نہ کیا۔

ہا سرکار عالم کا یہ سکوت واردات قلبی اور کیفیات روحانی کے اثرات سے تھا کہ بظاہر خاموشی تھی۔ اور فی الحقیقت تجلیات انوار جمال یار کے مشاہدہ میں ہمہ تن محو۔ اور ایسے مستغرق تھے کہ مطلوب حقیقی کی دید میں۔ ما و شما سے گفت و شنید کی فرصت نہ تھی اور معالجین نے اس حالت معنوی کو کثرت ضعف سے تعبیر کیا۔

مگر معلوم نہیں کیا مصلحت تھی کہ اسی شدت اضمحلال میں تقریباً سات بجے شب کو ہمارے نگران حال نے پہلے اپنے غلاموں کی جانب بکمال شفقت دیکھا۔ مابعد۔ باوجود اس غیر معمولی نقاہت کے۔ انگشتِ شہادت بلند فرما کر۔ نہایت ضعیف اور گلوگرفتہ آواز سے۔ مگر پرجوش لہجہ میں ارشاد ہوا کہ "اللہ ایک ہے۔" جس کو جملہ حاضرین نے بخوبی سنا۔

اس ارشاد واری کا مفہوم یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ کا یہ دستور تھا کہ جلوت عام میں بھی اور خلوت خاص میں بھی حضور قبلۂ عالم کی لطائف آمیز اور معنی خیز تقریر کا زیادہ حصہ صفات توحید جناب احدیت کی تشریح و تصریح میں ہوتا تھا۔ جس کو دوسرے الفاظ میں یوں کہنا غیر موزوں نہ ہوگا کہ درحقیقت حضرت رب العزت عز اسمہٗ کی شان وحدانیت کے ذکر سے آپ کو فطرتاً شوق تھا اور اسی قدیم عادت کا یہ اقتضا تھا کہ آپ نے ضعف و نقاہت کی ناقابلِ برداشت کشمکش میں بھی خدائے بزرگ و برتر کی یکتائی کا ذکر بالاعلان کیا اور ذکر کے ساتھ بطور شہادت انگلی کا اشارہ بھی کر دیا کہ خدا ایک ہے۔

یا اپنے عقیدت شعار غلاموں کو خبردار کرنا منظور تھا کہ خدا کو وحدہٗ لاشریک سمجھنا اور ہمیشہ اس کی محبت میں مصروف رہنا۔

چنانچہ آپ کی اس گرانقدر اور پُراثر آواز کا یہ تصرف دیکھا کہ سامعین نے اپنے شفیق داعی الی اللہ کے اس آخری اشارہ پر لبیک کہا۔ اور غیر معمولی جوش میں مدہوش ہو کر عرض کیا "لا الٰہ الا اللہ"۔

دس بجے سرکار عالم پناہ نے استنجا کیا۔ خادم نے شدت تپ کی وجہ سے لبہائے مبارک خشک دیکھ کر عرض کیا کہ تشنگی ہو تو پانی حاضر کروں۔ آپ نے حسب عادت فرمایا کہ "اچھا"۔ حکیم عبدالحی صاحب نے کہا کہ بجائے پانی کے اگر عرق گاؤزبان دیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ خادم نے وہی پیش کیا۔ حضور نے ایک گھونٹ نوش فرما کر پھر عالم سکوت میں آنکھیں بند کر لیں۔

لیکن قبل ازیں یعنی بعد مغرب معالجین نے بخیال تقویت خشخاص کے ساتھ جوارش مروارید جس میں شیر خشت کا بھی اشتراک تھا۔ استعمال کرا چکے تھے۔ اس کا فعل یہ ہوا کہ بارہ بجے ایک اجابت ہوئی اور دو مرتبہ بلغم بھی خارج ہوا اور بصورت سکون غنودگی کے آثار نمایاں ہوئے مگر انجماد بلغم کے سبب سے یا کثرت ضعف کی وجہ سے سلسلۂ انفاس ظاہرہ میں بکمال وضاحت وہ آواز آنے لگی جو ہمیشہ سے مستتر تھی۔ یعنی آپ کا ذکر بجائے اخفا کے ظاہر ہو گیا۔ اور صاف طور پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نو عمر لڑکا لا الٰہ الا اللہ کا ذکر بالجہر کر رہا ہے اور تا دم واپسیں یہ آواز مسلسل اور یکساں آتی رہی۔

اس دوران میں اطبا نے جب نبض دیکھی تو ہر مرتبہ یہی کہا کہ آپ حضرات پریشان نہ ہوں جناب والا کا مزاج اچھا ہے۔ نبض بدستور قوی اور منتظم ہے بجز اس کے آج اضمحلال نسبتاً کچھ زائد ہے اور شدائد تپ کا اثر ہے جو عموماً ہوتا ہے۔

یہ سُنکے بعض مقتدر ارادتمند مطمئن ہو کر بستر پر چلے گئے مگر مخصوص خدمتگزار اپنے آقائے نامدار کے فرش کے گرد حلقہ کئے بیٹھے رہے۔ اور اس اثنا میں معالجین نے باہمی مشورے سے ازالۂ تپ کے لئے جو تدبیریں کیں۔ ان میں اکثر تو بے سود ثابت ہوئیں۔ اور اگر کوئی موثر ہوئی تو عارضی طور پر کہ اس کا فائدہ جلد زائل ہو گیا۔

حتیٰ کہ قریب دو بجے کے حکیم مرزا یعقوب بیگ صاحب وارثی نے تھرمامیٹر لگانا چاہا تو دیکھا کہ بخار بالکل اُتر گیا ہے۔ اور ہاتھ پاؤں سرد ہیں۔ حکیم عبدالغنی صاحب اور حکیم سلطان محمود نے گھبرا کے نبض دیکھی تو مطمئن ہوئے اور کہا تپ اتر گئی۔ لیکن اب جواہر مہرہ دینے کا وقت ہے۔ تاکہ تقویت ہو۔ اور یہ صورت غشی بھی زائل ہو جائے۔

مگر بعض اطبا کی رائے تھی۔ کہ جواہر مہرہ چونکہ زیادہ قوی ہے اس وجہ سے اندیشہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حرارت کو تحریک نہ ہو۔ لہٰذا اعتدالی صورت اختیار کرنا بہتر ہے کہ اسی ملین اور مفرح بدرقہ کے ساتھ جوارش مروارید استعمال کرائی جائے۔

ہنوز یہ مشہور ہو رہا تھا کہ دو بج گئے۔ اور یہ عجیب و غریب واقعہ پیش آیا کہ دفعتاً صحن مکان میں زیادہ اور دالان میں کم ایسی شفاف روشنی نظر آئی کہ حاضرین مرعوب ہو گئے اور اس کے ساتھ یہ بھی دیکھا کہ حضور قبلہ عالم نے دونوں ہاتھ اس عنوان سے بلند فرمائے جو شکل مصافحہ کرنے میں نمایاں ہوتی ہے۔ اور سر اقدس کو بھی اس طرح جنبش ہوئی جس سے بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ اٹھنے کا قصد فرماتے ہیں۔

اس حیرت انگیز کرشمہ قدرت کے مشاہدے سے بعض ارادتمند ساکت اور متحیر تھے اور بعض اہل خرد شاید اس واقعہ کے مفہوم معنوی سے متاثر ہو کر اشکبار مگر مؤدب کھڑے ہو گئے۔

اور ابھی یہ حالت کلیتہً فرو بھی نہیں ہوئی تھی کہ کسی نے اس واقعہ کی اطلاع اُن خدمت گزاروں سے کر دی جو در دولت پر حاضر تھے۔ اور ان سے دوسروں نے سُنا چنانچہ آنِ واحد میں یہ خبر ایسی مشتہر ہو گئی کہ جملہ غلامان بارگاہ وارثی و نیز حضرات اہل قصبہ اپنے اپنے بستر سے اٹھ کر اُفتاں و خیزاں حاضر ہوئے اور دس منٹ میں اس قدر ہجوم ہو گیا کہ مکان میں گنجائش نہ ہونے سے سیکڑوں جاں نثار باہر مغموم کھڑے تھے۔

حالانکہ معالجین اس وقت بھی یہی کہتے تھے کہ حالت خطرناک نہیں۔ گو کہ افراطِ ضعف کو بھی مخدوش لکھا ہے لیکن نبض کا انتظام چونکہ بدستور ہے اس لحاظ سے امید ہے کہ طبیعت علاج پذیر ہو جائے۔ ہاں مشیت خداوندی کیا ہے۔ اس کو بھی بہتر جانتے ہیں جن کی آپ خدمت کر رہے ہیں۔

لیکن اس وقت کی فضا قدرتاً ایسی غم آلود تھی جس کے اثر سے خود بخود خدمت گزار جو اپنے اپنے خدمات میں منہمک تھے مگر حسرت و یاس کے عالم میں مضطرب یا محزون ضرور تھے۔

اس عرصہ میں حکماء کی تجویز سے حاجی فیضو شاہ صاحب خادم خاص نے شربت شہد

پیش کیا اور جناب حضرت نے ایک چمچہ نوش فرمایا۔ تو گونہ سکون محسوس ہوا مگر چند ساعت کے بعد پھر لبہائے مبارک خشک ہوگئے اور الجھن ہونے لگی۔

تھوڑا وقفہ گزر گیا کہ حکیم عبدالحی صاحب نے کہا کہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہی شربت دوبارہ استعمال کرایا جائے۔ چنانچہ خادم موصوف نے پھر شربت شہد پیش کیا۔ اور آقائے نامدار نے اسی قدر نوش بھی فرمایا۔ مگر اس مرتبہ وقتی سکون بھی نہیں ہوا۔

یہ دیکھکر حکیم سلطان محمود صاحب لخلخہ تیار کرنے میں مصروف ہوئے اور حکیم مرزا یعقوب بیگ صاحب کا ایک ہاتھ جناب حضرت کے دست حق پرست کے نیچے اور دوسرا ہاتھ نبض پر تھا اور بار بار یہی کہتے تھے کہ نبض بالکل صحیح ہے۔ حتیٰ کہ چار بج گئے اور وہ ساعت قریب آگئی جس کا اشتیاق دید میں حضور قبلۂ عالم انتظار فرمارہے تھے کہ ناگاہ حکیم صاحب نبض چھوڑ کر بے اختیار رونے لگے۔ اور کہا کہ جناب حضرت کی آخری زیارت کرلو۔

چنانچہ چار بج کے تیرہ منٹ ہنوز پورے ہورہے تھے کہ خدائے برتر کی وہ گرانقدر ودیعت حجاب عظمت میں مستور ہوئی۔ اور چھیاسی یا اٹھاسی سال کا دور فراق ختم ہوگیا کہ شاہد بے نیاز نے اپنے عاشق جانباز کو جلوت عالم سے خلوت خاص میں طلب فرمایا۔ یعنی حضور قبلۂ عالم حدود تعینات سے گزر کے اس نقطۂ سرمدی سے واصل ہوگئے۔ جو فی الحقیقت موجود مطلق اور مقصود حقیقی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ذکر تجہیز و تکفین اس حادثۂ جانکاہ سے خاص و عام اس قدر متاثر ہوئے کہ اندر سے باہر تک کہرام مچ گیا۔ بعض کا مقولہ ہے کہ زلزلہ بھی محسوس ہوا اکثر حضرات نے کہا کہ تند ہوا کا ایک جھونکا آیا جس میں سے غیر مانوس زبان میں ایسی آواز آتی تھی جو گریہ وزاری سے بہت مشابہ تھی۔ بعض مولفین سیرت وارثی نے دیگر آثارات حزن و غم کا اظہار ہونا بھی نقل کیا ہے اہل قصبہ مثل ماہی بے آب تڑپنے لگے۔ ارادتمندوں کی دلخراش آہ و بکا سے قیامت برپا تھی جن کا حال زار دیکھکر یار و اغیار کہتے تھے کہ دلدادہ جمال وارثی تو چند روزہ جدائی

کے بھی متحمل نہ تھے۔ اب آقائے نامدار کی مستقل مفارقت کی برداشت کیونکر کریں گے۔
اکثر حفاظ تلاوت قرآن پاک میں مشغول ہو گئے بعض عقیدت شعار درود شریف بعض کلمہ طیبہ پڑھنے لگے۔ غرض اسی حالت میں وہ بقیہ حصہ شب کا ختم ہوا اس وقت شیخ مظہر علی صاحب وارثی رئیس سولی نے جن کا قدیم اور مخصوص غلاموں میں شمار تھا حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا بھائیو! حاجی صاحب قبلہ کی مفارقت کا غم وہ غم نہیں ہے جو آج ہی ختم ہو جائے بلکہ رونا تو ہماری قسمت میں تا زندگی ہے۔ لیکن اب ضرورت اس کی ہے کہ تھوڑے عرصہ کے واسطے صبر کرو اور اپنے رہنمائے کامل کی آخری خدمت کو انجام دو۔
مگر قبل اس کے کہ آپ تجہیز و تکفین کا انتظام کریں۔ بطور یاددہی یہ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جملہ غلامان بارگاہ وارثی کو اس کا علم ہے کہ جناب حضرت نے متواتر فرمایا ہے کہ "فقیر جہاں مرتا ہے وہیں دفن ہوتا ہے" بلکہ اس فرمان کو منشی خدابخش صاحب شائق اور حکیم سید عبدالاحد شاہ صاحب بخیر اپنی اپنی تالیف میں نقل کر چکے ہیں اور ہمارے دیگر ممتاز بھائیوں نے مان لیا ہے کہ یہ فرمان آپ کے مسلک کا جزو اعظم اور مشرب کا رکن خاص ہے مگر باوجود اس اہمیت کے آپ کا استمزاج لینا بھی ضرور ہے اس لئے پہلے یہ تجویز فرمائی کہ مزار اقدس کہاں ہو۔
شیخ صاحب کی یہ تقریر سن کے غلامان وارثی بے قرار ہو گئے۔ اور کہا کہ یہ فرمان اکثر حضور قبلہ عالم کی زبان مبارک سے ہم نے بھی سنا ہے مگر افسوس اس نوشتہ تقدیر سے بے خبر تھے کہ ایک روز خود دیدولت کی قبر کا مسئلہ پیش ہوگا اور ہم کو اس ارشاد کی تعمیل کرنا ہوگی۔
لہٰذا ہم غلاموں کا فرض منصبی یہ ہے کہ وہی کرنا چاہیئے جس کی قبل از وقت بار بار ہدایت ہو چکی ہے یعنی اسی جگہ آپ کی آرام گاہ بنائیں۔ جس مقام پر اس وقت جناب والا آسودہ ہیں۔
غلامان بارگاہ وارثی کی یہ متفقہ رائے سن کے شیخ مظہر علی صاحب کھڑے ہو گئے اور اپنے محمود الصفات آقا کے جسد اطہر کو معہ بستر راحت تھوڑا مشرقی سمت ہٹا کر قبر کا نشان

ڈالا اور پیر غلام کسگر نے معہ چند ہمراہیوں کے کھودنا شروع کیا۔

اسی عرصہ میں حاجی عباس حسین خاں صاحب وارثی تشریف لائے اور بزرگانہ حیثیت سے فرمایا کہ آپ حضرات جو خدمت کر رہے ہیں یہ ہر طرح سے مستحسن ضرور ہے لیکن بعض وجوہات سے خلاف مصلحت بھی ہے۔ مثلاً گنجائش بہت محدود ہے اور اس کام کے لئے چھوٹی بی بی صاحبہ اپنا وہ باغ نذر کرتی ہیں جو شاہ اویسؒ کے قبرستان کے قریب ہے وہاں بہت بڑا مقبرہ آپ تعمیر کرا سکتے ہیں۔ قطع نظر اس کے یہاں قبر بنانے سے یہ چار ہزار روپیہ کی عمارت بالکل بے کار ہو جائے گی جو صریح نقصان ہے۔

شیخ منہر علی صاحب نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ فرمایا کہ بھائی صاحب آپ کی اس فہمائش کا شکر گذار ہوں لیکن خدا کو منظور ہے تو حاجی صاحب کی ہدایت کے مطابق مزار اقدس یہیں بنے گا اور یہ مکان جس کو آج آپ نے چار ہزار کا تجویز کیا ہے۔ کل بحیثیت مزار مبارک چار کروڑ سے زیادہ قیمتی ہو جائے گا۔ لہٰذا معاف فرمائیے گا کہ آپ کو مکان کی فکر ہے اور ہم کو اس حکم کی تعمیل کا خیال ہے جو قبلۂ عالم نے متواتر فرمایا ہے کہ "فقیر جہاں مرتا ہے وہیں دفن ہوتا ہے"۔

اس لئے علاوہ ارادت وعقیدت کے انصاف سے بعید معلوم ہوتا ہے کہ ایسا ممتاز اور جلیل القدر فقیر جس نے ہزاروں کو اپنے تصرفات باطنی سے فقیر بنا دیا اس برگزیدہ کردگار کا مقدس مزار وہیں نہ بنایا جائے۔ جس مقام پر وہ بادۂ وصال شاہد حقیقی سے سرشار ہوا ہے۔

خانصاحب موصوف نے آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ برادر جناب حضرت کے مشہور ارشاد کا یہی مفہوم ہے جو آپ نے کیا اور کر رہے ہیں۔ لیکن میں نے جو کچھ کہا وہ اس واسطے کہ بعض لوگوں کو اختلاف ہے۔ اور یقینی وہ آپ کی اس کارروائی میں ضرور مانع ہوں گے۔ آئندہ آپ کو اختیار ہے۔ والسلام۔

جب خانصاحب یہ نصیحت فرما کر واپس گئے اور غلامان وارثی سامان غسل فراہم کرنا

چاہتے تھے کہ پیر غلام گورکن نے کہا کہ پہلے اس کا انتظام کیجئے کہ زمین بہرا دکی نکل رہی ہے۔ دیکھا تو واقعی پانچ فیٹ گہرائی کے بعد بھی مٹی قابل اطمینان نہیں نکلتی۔ جس کی نسبت کسی نے تو یہ کہا کہ مٹی زیادہ کمزور نہیں ہے کسی نے کہا اگر کمزور بھی ہے تو بوجھ سے دبنے کے بعد اندیشہ نہ رہے گا۔ مگر منشی عزیز احمد صاحب وارثی سب اوورسیر نے یہ مشورہ دیا کہ بوجھ سول کے ساتھ اگر صندوق کی دیواریں پکی اینٹ سے بنادی جائیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔

غلامان وارثی نے اسی رائے کو پسند کیا اور اسی وقت اینٹیں تلاش کرائیں اور معمار و مزدور بھی بلائے۔ گارے کے واسطے مٹی چھانی جاتی تھی کہ ایک سب انسپکٹر پولیس آئے۔ اور جملہ خدمت گزاروں کی جانب مخاطب ہوکر یہ کہا کہ آپ لوگ علانیہ قانون شکنی کررہے ہیں اس لئے کہ ہر خاص و عام کو معلوم ہے کہ آبادی کے اندر قبر بنانا ممنوع ہے۔

بابو کنہیا لال صاحب وارثی وکیل علیگڈھ نے ان کو جواب دیا کہ داروغہ صاحب یہ حکم حدود میونسپلٹی کے واسطے موقوف ہے اور یہاں میونسپلٹی نہیں۔ تاہم ہمارا یہ فعل قابل الزام معلوم ہوتا ہے تو بھی پولیس کو دست اندازی کا حق نہیں۔ آپ اسی قدر کرسکتے ہیں کہ میرے نام کی رپورٹ کردیں کہ کنہیا لال نے خلاف ضابطہ بستی کے اندر قبر بنالی کیونکہ قبر تو ہر حالت میں یہیں بنے گی۔

یہ سنکے سب انسپکٹر صاحب نے کہا کہ بہتر ہے۔ ہم ڈپٹی کمشنر کو اطلاع کرتے ہیں اور مجوب ہوکر چلے گئے۔ اسی اثنا میں سب سامان مہیا ہوگیا تھا۔ قبر کی تعمیر بھی شروع ہوگئی اور خدام مشرقی صحنچی میں غسل کا انتظام بھی کرنے لگے۔

جب حضرات مانعین نے یہ دیکھا کہ داروغہ پولیس کی ترہیب سے بھی انسداد نہ ہوا اور قبر بدستور بنائی جاتی ہے تب انھوں نے یہ تیسری صورت اختیار کی کہ ایک زمیندار صاحب کی معرفت معماران و مزدوران کو یہ تنبیہ کرائی کہ بغیر ہمارے حکم کے اگر قبر بناؤ گے تو قصبہ میں رہنے نہ پاؤ گے۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ بجز غفور معمار کے جملہ معمار و مزدور خائف ہوکر اپنے

اپنے گھروں میں روپوش ہو گئے۔ اور دفعتاً قبر کا تعمیر ہونا بند ہو گیا۔

یہ دیکھکر فقرائے وارثی اور بعض دیگر عقیدت شعار خدمت گذار اپنے آقائے بندہ کا مزار پُر انوار بنانے کے جوش میں مزدوروں کا کام کرنے کے لئے تیار ہو گئے اور بہ ہزار فخر و مباہات اپنے سروں پر رکھکر اینٹ اور گارا پہونچانے لگے۔ اور بعض ذی اقتدار حضرات رعنفور معمار کے شریک کار ہوئے۔ جن کی مدد سے چند گھنٹوں میں قبر تیار ہو گئی۔

اور اسی دوران میں مخصوص اہل قصبہ اور مخلص ارادتمندوں نے بکمال احتیاط و اہتمام اپنے سرکار عالم پناہ کے جسد اطہر کو پہلے پانی سے بعدہٗ کیوڑہ اور گلاب سے جس میں آب زمزم بھی شریک تھا، مشرقی صحنچی میں غسل دیا۔ اور تبرکاً آب غسالہ اس طرح اٹھا لیا کہ ایک قطرہ ضایع نہ ہوا۔

دوران غسل میں کفن کا مسئلہ بھی پیش ہوا۔ اور مخصوص خدام نے حاضرین سے مخاطب ہو کر یہ کہا کہ رنگین احرام بھی موجود ہے اور سفید کفن بھی قطع شدہ تیار ہے اب آپ حضرات کی رائے عالی پر اس کا تصفیہ منحصر ہے کہ بہ لحاظ شان وارثی جو کفن مناسب متصور ہو وہ حاضر کیا جائے۔ لیکن قبل انتخاب یہ پیش نظر رہے کہ ان ارشادات کے ماسوا۔ جن میں فقرا کو بجائے کفن معروف کے انہیں کے تہبند میں ان کو دفن کرنا مذکور ہے۔ خود حضور قبلہ عالم نے لطور عملدرآمد اپنے خرقہ پوش غلاموں کے کفن کے واسطے تہبند اور لنگوٹ مرحمت فرمایا ہے۔

چنانچہ منجملہ دیگر شنیدہ اور دیدہ واقعات کے خاص دیوی شریف میں تین فقیروں کی تکفین کے واسطے جناب حضرت نے باوجود سفید نین سکھ کا تھان موجود ہونے کے رنگین احرام تفویض فرمایا اور لصراحت ارشاد ہوا کہ " اسی کو لپیٹ کر دفن کر دو۔ فقیر کا یہی کفن ہے "

ان تین خوش نصیبوں میں پہلے بنام شاہ صاحب ہیں کہ ان کے انتقال کی خبر آئی تو سرکار عالم پناہ نے ان کی تکفین کے لئے تہبند اور لنگوٹ دیکر فرمایا کہ یہی ان کا کفن ہے۔

دوسرے آپ کے بہشتی فقیر بخش جو تہبند پوش تھے ان کو حسب ہدایت جناب حضرت غلامان وارثؒ نے اسی احرام میں دفن کیا۔ جو کفن کے واسطے حضور قبلۂ عالم نے عطا فرمایا تھا۔ تیسرے حاجی بھورے شاہ صاحب کا جب دربِ دولت پر انتقال ہوا تو ان کے بھی کفن کے واسطے قبلۂ عالم نے تہبند عنایت فرمایا۔ لہٰذا آج خود بدولت کے لباس آخری کی جو نوعیت زیادہ موزوں معلوم ہو وہ تجویز فرمایئے۔

بعض حضرات جو بجہت عقیدت اس موقع پر حاضر تھے انھوں نے برجستہ فرمایا کہ کفن کے لئے کسی تخصیص اور مشورت کی کیا ضرورت ہے تکفین بصورت مروجہ ہونا چاہیئے، جو علمائے متقدمین کی تجویز کردہ ہے اور اگر جناب حاجی صاحب نے کسی فقیر کی تکفین کیواسطے تہبند کا حکم دیا ہے تو شاید اس کی ناداری کے خیال سے فرمایا ہوگا۔ یہاں وہ مجبوری نہیں غلامانِ بارگاہِ وارثی کے علاوہ بھی معتقدین بآسانی اس کا انتظام کر سکتے ہیں۔ لیکن شرعی پہلو کو اگر دخل ہے تو اس کو آپ لوگ ہم سے بہتر جانتے ہیں۔

یہ سُن کے اکثر پرستاران بارگاہِ وارثی نے پُرجوش لہجہ میں کہا کہ مجبوری تو جب تھی اور نہ اب ہے۔ لیکن ہمارے مجتہد اعظم نے اپنے خرقہ پوش متبعین کی تکفین کے واسطے جب کہ رنگین تہبند جائز اور کافی متصور فرمایا ہے تو اس اعتبار سے بجز اس کے دوسرا خیال بھی نہ آنا چاہیئے کہ ان فقیروں کے مربی اور رہنما کا بھی لباس وداعی احرام ہو۔

کیونکہ جس مرد میدان فقر و فنا کی یہ جلیل القدر خصوصیت ہو کہ بہتّر برس تک احکم الحاکمین کے سالانہ دربار کی وردی اس کا مستقبل لباس رہا۔ تو لازمات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرب الٰہی کی آخری منزل میں بھی وہ صاحب تجرید و تفرید اسی قدیم لباس میں اور اسی شان سے جائے جو شاہد بے نیاز کے عاشقانِ جانباز کی مخصوص وضع ہے۔

ہنوز کوئی رائے قائم نہیں ہوئی تھی کہ بارگاہ وارثی کے ایک دیرینہ حلقہ بگوش نے بکمال ادب یہ کہا کہ اس میں تو کسی کو عذر نہیں کہ حضور قبلۂ عالم نے متواتر فرمایا ہے کہ فقیر مر جائے

تو اس کے تہبند میں لپیٹ کر اس کو دفن کر دو“ اور کبھی یوں ارشاد ہوا ہے کہ فقیر کا تہبند ہی اس کا کفن ہے“، یہ حکم بظاہر تکفین فقراء کی آسانی کے واسطے ضرور معلوم ہوتا ہے مگر صرف آسانی ہی کے واسطے نہیں ہے بلکہ درحقیقت ماسوائے اللہ سے بے غرض رہنے کا یہ دقیق سبب ہے کہ ہمارے غیور بندہ لہٰذا کو منظور یہ تھا کہ ہمارے نادار اور تہی دست فقراء کا کفن بھی ذی استطاعت اہل دنیا کی امداد و استعانت سے محفوظ اور بے نیاز رہے جو فالغین کے استغنائے کامل کی دلیل اور متوکلین کے ثبات و استقلال کا خلاصہ ہے۔

مگر چونکہ تکفین مروجہ سے ہماری طبیعت مانوس ہو گئی ہے اس لحاظ سے اگر کسی کو جناب حضرت کی یہ ہدایت جدید تعلیم معلوم ہوتی ہو تو عجب نہیں یا کم از کم مادشما کو یہ خیال ہو کہ یہ حکم آپ کا ذاتی اور وقتی اجتہاد ہے جو کسی خاص موقع پر فقراء کو دیا ہو گا۔ تو بعید نہیں لیکن کتب احادیث کی ورق گردانی کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرکار عالم پناہ نے یہ حکم نافذ فرمانے میں اپنے جد نامدار کی کامل اتباع فرمائی ہے۔ چنانچہ مولانا جلال الدین سیوطی علیہ الرحمۃ نے بدور السافرۃ فی امور الآخرۃ میں نقل فرمایا ہے کہ ایام حج میں ایک احرام پوش کو اونٹنی نے ایک ایسی ٹکر ماری کہ وہ مر گیا تاجدار مدینہ نے حکم دیا کہ انھیں کپڑوں میں اس کو دفن کر دو۔ یہ لبیک کہتا ہوا محشور ہو گا۔

اس روایت سے جب کہ یہ معلوم ہو گیا کہ تکفین کسی وضع کے ساتھ مشروط نہیں ہے بلکہ میت کا لباس بھی اس کا کفن ہو سکتا ہے تو اب ہمارا یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ حضور قبلۂ عالم کا یہ ارشاد کہ فقیر مر جائے تو اس کے تہبند میں لپیٹ کر اس کو دفن کر دو۔ حدیث مذکورہ کا صحیح ترجمہ ہے۔

اور اگر گہری نظر سے دیکھتے ہیں تو حضور قبلۂ عالم کے یہ ارشادات کلیۃً آپ کی جدہ ماجدہ حضرت خاتون جنت کی مخصوص سنت کے مطابق ہیں۔ جیسا کہ شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی علیہ الرحمۃ نے جذب القلوب الی دیار المحبوب میں لکھا ہے کہ ایک روز بنت

رسول اللہ صلعم نے بکمال اہتمام غسل کیا اور پاکیزہ لباس پہن کر بستر راحت پر آرام فرمایا۔
اور کنیز سے وصیت کی بعد مفارقتِ روح مجھ کو اسی لباس میں اور اسی جگہ دفن کرنا۔ چوں
علی مرتضٰے درون خانہ آمد صورت حال بوئے باز نمودند۔ دید کہ روح پاکش بہ اعلیٰ علیین
رسیدہ بود۔ فرمود کہ واللہ ہیچ کس او را نکشاید بہ ہماں غسل سابق و جامہ کہ پوشیدہ بود دفن کرد۔"
یہ روایت بھی قطعیت کفن کے منافی ہے۔ کیونکہ اگر کوئی صورت لازمی ہوتی تو علی
مرتضٰی جو باب مدینۃ العلم کے ممتاز خطاب سے سرفراز تھے ضرور اس کی پابندی فرماتے اور
بنتِ رسول اللہ کے جسد اطہر کو اسی لباس میں جو قبل انتقال روح زیب جسم اقدس تھا دفن نہ کرتے۔
بلکہ حضور قبلۂ عالم کے اس حکم متواتر سے کہ "فقیر کا تہبند اس کا کفن ہے" یہ اشارہ کرنا
ظاہر کرتا ہے کہ جس طرح اپنے زاہدین مسترشدین کو صبر و ثبات میں سرچشمۂ فقر حضرت خاتون
جنت کی تقلید و اتباع کا حکم دیا اسی طرح یہ ہدایت فرمائی کہ تمہارا لباس ہی تمہارا ہی
کفن ہے جو سنت فاطمی کی عین تبعیت ہے۔
علیٰ ہذا دیگر روایات کے مطالعہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قرن اولیٰ میں اکثر تکفین
مختلف وضع سے ہوئی۔ اسی وجہ سے علمائے دین و فقہائے شرع متین نے کفن کو کسی
خاص شرط کے ساتھ مشروط نہیں کیا۔ بلکہ کفن کے اعلیٰ یا ادنیٰ یا عریض یا طویل ہونے
کو متولی متوفی کی مالی حیثیت و استطاعت پر موقوف گردانا۔
چنانچہ خود شارع اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عم بزرگوار حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی
تکفین صرف ایک وہ بھی ایسی چھوٹی چادر سے فرمائی جو پورے جسم اقدس کو پوشیدہ
نہ کر سکی۔ اور پائے مبارک کھجور کے پتوں سے چھپائے گئے۔
خلاصہ یہ کہ کفن مروجہ بھی اس اعتبار سے مستحسن ضرور ہے کہ اس کی نوعیت کو جمہور نے
پسند کیا۔ لیکن مستند روایات سے جب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ کفن قیود نوعیت سے بے نیاز
ہے تو زیادہ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ہمارے آقائے نامدار کی ذات

بابرکات مجموعہ صفات و حسنات تھی۔ اور ہر قوم و ملت کے طالبین کی رہنمائی میں آپ نے مساوات کو قایم رکھا۔ اسی طرح آپ کا مقدس کفن بھی ایسے اوصاف جامعیت سے موصوف ہونا چاہیئے جس کو اہل دنیا بھی اور تارک دنیا بھی اپنے اپنے خیالوں کے موافق اور مذاق کے مطابق منصور فرمائیں یعنی اگر مشرب کے گہرے رنگ میں ڈوبا ہو تو مذہب کی شان بھی نمایاں طور پر نظر آئے۔

غرض بعد گفت و شنید اہل ارادت نے باتفاق رائے یہی صورت پسند کی کہ جس طرح سے حضور قبلۂ عالم نے ضوابط مشربی کی بہ حد تمام نگاہداشت فرمانے کے ساتھ شرائط مذہبی کا بھی پورا خیال رکھا۔ لہذا آپ کے اس اسوۂ حسنہ کی تقلید کی جائے۔ اور آپ کا مقدس کفن ہر دو صفات سے ایسا آراستہ ہو جس کو مسلک سے بھی کما حقہ واسطہ اور مذہب سے بھی کافی سروکار ہو۔

حضور کی تکفین چنانچہ اسی خیال کے مطابق پہلے بہ لحاظ مشرب آپ کا مخصوص لباس یعنی اصفر اللون احرام اسی عنوان سے زیب جسم کیا گیا جو آپ کی قدیم وضع تھی اور باعتبار مذہب دو سفید چادریں جن کو اصطلاح فقہا میں ازار و لفافہ کہتے ہیں۔ اوپر سے لگا دیں اور پوشش کے واسطے رنگین چادر ڈال دی۔ جو دفن کے وقت علیحدہ کر لی گئی۔

جب غسل و کفن سے فارغ ہوئے تو یہ مشورہ ہونے لگا کہ نماز کہاں ہو تا کہ جملہ حاضرین شریک ہو سکیں لیکن باوجودیکہ بہت غور کیا مگر کوئی تدبیر نہ کر سکے۔ کیونکہ اژدہام اس قدر تھا کہ جنازہ دالان سے باہر لانا اور نماز کا اہتمام کرنا محالات سے معلوم ہوا۔ مجبور ہو کر قبر کے قریب حافظ عبد القیوم صاحب وارثی رئیس کرنال نے نماز پڑھائی اور بعد عصر خاص خاص ارادتمندوں نے اس سیاح عالم ملکوت واصل ذات حی لایموت کے جسد اطہر کو سپرد خاک کیا یعنی یکم صفر سنہ ۱۳۲۳ ہجری بروز جمعہ وہ حق نما صورت - ہم ظاہر بینوں کی نظر سے پوشیدہ ہو گئی چنانچہ یہ مصرع مادۂ تاریخ ہے۔ "پس حجاب شد آفتاب اندر حجاب"
۱۳ ۲۳ ہجری

یا یہ کہا جائے کہ فَضَّلْنَاكَ عَلَى الْعَالَمِينَ "
۲۳ ہجری ۱۳

اب وہ حالات و واقعات جو بعد از وصال تا ایندم وقوع پذیر ہوئے ان کا موضوع چونکہ دوسرا ہو گا اس لئے حیات مستعار نے اس قدر زمانہ پایا تو انشاء اللہ جلد ثانی میں نگارش کر دوں گا۔ اور مجموعہ ہذا کو اس تاریخی مناجات پر ختم کرتا ہوں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔

ترجمہ خط وائیکونٹ گلازرا آف بینٹا کلارا مورخہ ۳۱ اگست ۱۹۴۳ء

محترم بندہ۔ حضرت حاجی صاحب قبلہ کے متعلق جو سوال آپ نے مجھ سے پوچھا ہے اس کا جواب لکھتے ہوئے مجھے مسرت ہوتی ہے۔ آپ کے ارشاد کے مطابق اب میں عرض کرتا ہوں کہ حاجی صاحب کے متعلق مجھے کیا کچھ معلوم ہے۔ اس متلاشی حق بزرگ سے میری ملاقات کا ہونا میری زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے جس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ میرے سوانح حیات کے کم از کم ایک سرسری مطالعہ کے بغیر مشکل سے کیا جا سکتا ہے۔ جو وابستگی مجھے ان کی ذات سے تھی اس کا حال قلمبند کرنا میرے لئے مسرت کا موجب ہے۔ میری ممنونیت کا تقاضا بھی یہی ہے۔ اور ممنونیت ان پاکیزہ اوصاف میں سے ہے جن کو خداوندی کہا جا سکتا ہے۔

جو وابستگی مجھے حاجی صاحب قبلہ کی ذات سے رہی ہے وہی میری زندگی کا ایک ایسا رشتہ ہے جو بشری خامیوں سے مبرا ہے۔ ان سے زیادہ مجھے کوئی محبوب نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ جو عقیدت مجھے اپنی والدہ سے تھی وہ بھی میرے دل کو اس قدر معمور نہ کر سکی بلکہ اپنی والدہ کے متعلق میری سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ انہیں حاجی صاحب قبلہ کی اُسی بے نیازی اور ترک علائق نصیب ہوتا کہ اپنی وفات کے بعد وہ ہستی اور نیستی کے چکر سے آزاد ہو جائیں۔ حاجی صاحب کی ذات میرے لئے پاکیزگی اور برتری کے ان تمام خوابوں کی تعبیر تھی جو عرصہ دراز سے میرے دل و دماغ میں سمائے ہوئے تھے گویا جب عالم ظاہری میں میری ان سے ملاقات ہوئی اس سے بہت عرصہ پہلے وہ میرے دل میں رہتے تھے جو پاکیزگی اور فوق البشر بے نیازی حاجی صاحب قبلہ کی ذات میں نظر آتی تھی۔ اس کا

مجھے ایک دھندلا سا شعور اس وقت سے ہے جب ابھی میری عمر تیرہ سال کی تھی اس وقت میں نے ہز ہائی نس مہاراجہ کشمیر سے یہ دریافت کیا تھا آیا ہندوستان میں اب بھی کوئی خدا رسیدہ بزرگ ہیں۔ ۱۹۰۲ء یا ۱۹۰۳ء میں میں نے پہلی مرتبہ حاجی صاحب کا ذکر لندن میں سنا۔ اس زمانہ میں شیخ حبیب احمد صاحب ہندوستان سے آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے جو لش اور فلسفہ کے متعلق اپنے افکار بیان کئے۔ لیکن ان سے میری تشفی نہ ہوئی۔ میری تشنگی کو دیکھکر شیخ صاحب نے کہا کہ اگر تمہیں اس سے زیادہ کچھ مطلوب ہو تو میرے مرشد حاجی صاحب سے رجوع کرو۔ اس دن سے حاجی صاحب میرے خیال میں بس گئے اور وہ میری عرفان کی متلاشی روح کا منتہائے مقصود قرار پائے۔ میں نے ان سے ملنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ اس سے ایک سال پہلے میں نے اپنے والدین کی اجازت سے موسم سرما مصر میں بسر کیا تھا۔ وہاں مجھے یکسوئی اور سکون نصیب ہوا۔ اور میں نے صوفیائے کے طریق کے مطابق جو مجھے شیخ حبیب احمد نے سکھایا تھا۔ تنہائی میں اسمائے الٰہی پر غور و فکر کیا دوسرے سال مجھے پھر اجازت ملی اور میں اپنے عربی کے استاد شیخ حسن عسکری کے ساتھ پھر قاہرہ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے والدین مجھے ہندوستان ایسے دور دراز ملک میں جانے کی اجازت نہ دیں گے لیکن میں پوشیدہ طور پر پی اینڈ او کے جہاز مارمورا پر سوار ہو کر بمبئی پہنچا۔ اور دل میں یہ ارادہ کیا کہ بہت جلد لوٹ آؤں گا ورنہ والدہ متفکر ہوں گی میں نے چند روز بمبئی میں قیام کیا اور اس کے بعد لکھنؤ پہنچا۔ لکھنؤ میں جیسا کہ میرا دو ایک سال سے معمول تھا۔ میں تقریباً سات گھنٹے روزانہ ایک اندھیرے کمرے میں بیٹھکر تصور الٰہی میں مشغول رہتا تھا۔ لکھنؤ سے میں حسن عسکری کے ساتھ ایک گاڑی میں سوار ہو کر دیوہ شریف روانہ ہوا۔ دوپہر سے پہلے میں حاجی صاحب کے آستانہ پر جا پہنچا۔ اس وقت میری حالت یہ تھی کہ میں شدت جذبات سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی کوئی ہندوستانی گاؤں یا گیروے لباس میں ملبوس فقیر نہ دیکھے تھے میرے گرد و پیش جس قدر چیزیں تھیں وہ اس دنیا کی معلوم ہوتی

تھیں، بلکہ ایک خواب کی مانند تھیں جس میں ظاہر و باطن محسوسات اور غیر محسوسات سب ایک دوسرے میں مدغم نظر آتے ہیں پھر حاجی صاحب تشریف لائے داہنے بائیں دو مرید تھے جن کے سہارے وہ چل رہے تھے لانبا قد جسم زہد و ریاضت سے نزار۔ نیلی آنکھیں آسمان کی طرح گہری اور شفاف پیشانی بیدھی اور بلند۔ خدوخال موزوں گورا رنگ سفید براق ڈاڑھی۔ ہونٹوں پر عنفوان شباب کی معصوم مسکراہٹ۔ میرے جذبے نے مجھے جرأت دلائی اور میں نے دوڑ کر سر آپ کے سینے پر رکھدیا۔ انھوں نے مجھے اپنے آغوش میں لے لیا۔ اور فرمایا "محبت محبت" ہم لوگ چٹائی پر بیٹھ گئے جن عسکری نے ان کی ترجمانی کی فرمایا یہ شخص کہاں سے آیا ہے؟ اس کا مذہب کیا ہے؟ دوسرے سوال کا میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ کیونکہ اس کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ مجھے صحیح یاد نہیں کہ حاجی صاحب نے اس پر کیا کہا۔ مگر کچھ ایسا خیال ظاہر کیا کہ سب مذاہب کا مقصد ایک ہی ہے لیکن میرے دل میں صرف ایک خیال تھا۔ جس کو میں ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ عسکری نے میری طرف اشارہ کر کے یہ کہا کہ یہ ہندوستان صرف آپ سے ملنے آئے ہیں۔ مشہور مقامات مثلاً تاج محل وغیرہ کی سیران کا مقصود نہیں۔ فرمایا کس چیز کی تلاش ہے۔ گویا میرے دل کی بات مجھ سے پوچھی۔ میں نے عرض کیا جی ہاں! میں چاہتا ہوں آپ میں مجھ میں کچھ فرق نہ رہے۔ حاجی صاحب مسکرا دیئے۔ چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ قدرے توقف کیا اور وہ الفاظ فرمائے جو ہزاروں برکتوں سے کہیں بڑھکر تھے فرمایا ہم اور تم وہاں ایک جگہ ہوں گے جس طرح ایک طویل محنت کے بعد پر سکون نیند آجائے ان کے الفاظ سے میری روح میں ایک طمانیت سی چھاگئی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا گویا مجھے گوہر مقصود ہاتھ آگیا ہے پھر میں نے گیروے رنگ کا ایک لباس ان کی خدمت میں پیش کیا جس کو انھوں نے پہن لیا اور اپنا بھورے رنگ کا لباس اتار کر مجھے عنایت فرمایا۔

اس کے بعد ان کے مرید ادگھٹا مجھے مہمان خانے میں لے گئے۔ لیکن مجھ پر

خواب کا سا عالم طاری تھا اس تصور کے عالم میں میری آنکھ لگ گئی شام کے وقت
اوگھٹ شاہ نے عسکری کے وساطت سے حضور کے بہت سے حالات بیان کئے اور
ان کی کرامات کا حال سُنایا لیکن میں نے بہت توجہ نہ کی۔ کیونکہ جو کچھ مجھے سُننا تھا
وہ حاجی صاحب کی زبان مبارک سے سُن چکا اور وہ ایسے الفاظ تھے جو کسی طرح
میری یاد سے محو نہ ہو سکتے تھے۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ اوگھٹ شاہ صاحب نے کہا کہ حاجی
صاحب نے ابتدائے عمر ہی میں غالباً جب ان کا سن اُنیس ۱۹ برس کا تھا کوچہ فقر میں
قدم رکھا۔ یہ بھی یاد ہے کہ اوگھٹ شاہ نے حضرات صوفیہ کا مشہور اصول
یعنی موتو قبل ان تموتو بھی بیان کیا۔ ورد کے وقت اسمائے الٰہی کو انگلیوں پر شمار
کرنے کا طریقہ بھی بتایا۔ جس پر میں خود عامل رہ چکا تھا جب رات ہو گئی تو محمدی نامی
ایک قوال اور دو اور قوالوں کو ساتھ لے کر اندر آیا اور چند عاشقانہ اور پر سوز
غزلیں گائیں جو تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

دوسرے دن ہم لوگ حضور سے رخصت ہوئے میں نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں
ان کا شکریہ ادا کیا لیکن میں اپنے الفاظ کی بے بضاعتی پر کڑھ رہا تھا۔

میں اسی جہاز پر سوار ہو کر مصر پہنچا اور قاہرہ کے قریب حلوان کے مقام پر توفیق
پیلس میں قیام کیا۔ میں ایک سال پہلے بھی یہیں مقیم تھا اور یہ مقام مجھے اس لئے پسند
تھا کہ اس کے چاروں طرف صحرا تھا۔ میرے اپنے نفس کا بھی اب یہ حال تھا کہ اس کے
چاروں طرف دنیا کا وسیع ریگستان پھیلا ہوا تھا۔ اور اسمائے الٰہی کے ورد کی خواہش
اب پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔

اسی طرح دو تین مہینے گزر گئے۔ ایک رات خواب یا یوں کہئے کہ کشف کے عالم میں
کیا دیکھتا ہوں کہ حاجی صاحب اکیلے کھڑے میری طرف دیکھ رہے ہیں اور ان کے داہنے ہاتھ
میں سرخ رنگ کا بڑا انار ہے میں نے پہچاننے کی کوشش کی کہ یہ کون سا پھل ہے لیکن پہچان

نہ سکا۔ پہلے میں نے کہا شاہ تڑہے۔ اور پھر جرمن میں کہا پراویزا ایپل یعنی انار ہے۔ حاجی صاحب نے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ اور پھر آدھا پھل خود کھایا۔ اور جو بچ رہا وہ مجھے دیا۔ جونہی میں نے پھل ان کے ہاتھ سے لیا وہ غائب ہو گئے۔ اب ان کی جگہ ادگھٹ شاہ کھڑے تھے۔ ادگھٹ شاہ نے کہا۔ مرشد کو وصال نصیب ہوا۔ اس پر میں اس قدر رویا کہ ہچکی بندھ گئی۔ لیکن پھر بھی میں خوش تھا اور نہ جانتا تھا کہ یہ آنسو خوشی کے آنسو ہیں یا غم کے۔ اسی حالت میں میری آنکھ کھل گئی یا یوں کہیے کہ میں عالم خیال سے عالم وجود میں آگیا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ پھل ان کا دل ہے۔ اور وفات سے پہلے انھوں نے اپنا آدھا دل مجھے بخش دیا ہے۔ دو تین دن بعد لندن سے شیخ حبیب احمد کا تار آیا کہ حاجی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ عسکری نے جب میرے خواب کا حال سنا۔ اور اس کو اس قدر سچا پایا۔ تو بہت حیران ہوا مجھے اس پر کچھ تعجب نہ ہوا۔ لیکن مجھ پر اس کا بہت اثر ہوا۔ اور میرا دل عقیدت کے جذبات سے بھر گیا۔ کیونکہ اس خواب کی تعبیر وہی مبارک الفاظ تھے۔ جو میں دیوہ شریف میں مرشد کی زبان سے سن چکا تھا۔

جو لباس مجھے حاجی صاحب نے عنایت کیا تھا۔ اسے میں نے کئی سال تک اپنے تکیے کے نیچے رکھا۔ اور سونے سے پہلے میں ہمیشہ اسے بوسہ دیا کرتا۔

۱۹۰۷ء میں مجھے ایک برتر ہستی کے ذریعے سے مجھ پر تمام کائنات کی حقیقت کا انکشاف ہونے لگا۔ ایک ایسی ہستی کے ذریعے سے جو عالم محسوسات سے بالاتر ہے۔ اس ہستی کے تصور کو میں نے اپنی روح کے اندر اپنے محبوب ترین دوست سے بھی اونچے درجے پر رکھا۔ لیکن حاجی صاحب کی ذات کا تصور اب بھی میرے شعور اور میری بے نام روح کی گہرائیوں میں جلوہ فگن ہے پرسوں جو سوال آپ نے مجھ سے پوچھا تھا۔ امید ہے کہ اس کا مکمل جواب اب آپ کو مل گیا ہوگا۔ دیوہ شریف کے اس پاک طینت بزرگ کے متعلق میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔

آپکا مخلص

گلازرا۔ وائیکونٹ آف سینا کلارا۔

قطعۂ تاریخ اتمام کتاب از نتیجۂ فکر عالی مقبول بارگاہ صمد جناب مولوی حکیم سید احمد صاحب وارثی مدظلہ

کرد چوں حضرت شہید اکمال صدرت — جمع حالات و مقالات کہ خود دید و شنید
داد تحقیق بداد و ہمہ حق گفت و نوشت — نکتہا نیز برافزود ز فقر و توحید
در کتابت سخن از روح مجسم آورد — تو خوش اللہ کہ چہ جاں در تن الفاظ دمید
قلمش ہمدم عیسیٰ و بداد آب حیات — حرفہا خود اگر آید بسخن نیست بعید
نسخہائے کہ ازیں پیش مؤلف شدہ بود — شہرت آں ہمہ یکبارہ بپایاں برسید
واں غلطہا کہ در آنہا ہمہ رہ یافتہ بود — للہ الحمد کہ شد دفع بتوضیح مفید

احمد خستہ رقم زد بمسیحی تاریخ
سیرت وارث پاک آمدہ فرقان مجید
۱۹۳۸ء

ایضاً قطعۂ تاریخ اتمام کتاب چکیدۂ قلم فصاحت رقم جناب مولوی حکیم سید احمد صاحب وارثی دام مجدکم

چہ زیبا سیرتے شہید ارقم زد — زہر لفظش عیاں آیات وارث
زحالات و مقالات آنچہ بنگاشت — نے باشد ز معجزات وارث

نوشت احمد بہجری سال تالیف
اہم مجموعۂ حالات وارث
۱۳ ہجری ۲۲

قطعۂ تاریخ طبع کتاب ہذا از تصنیف منیف جناب مولوی حکیم سید احمد صاحب وارثی دام اللہ فیضہ

طبع گردید بافضال آلہ — قصۂ ہادی منزل وارث
گفت احمد بمسیحی تاریخ — سیرت عاشق کامل وارث
۱۹۳۹ء

قد تمت الرسالۃ بعون الودود الحمید
۱۹۳۸ء

سرکار عالم پناہ کے وصال کے بعد تیسرے دن قل خوانی اور درود پاک

کے بعد جو **سلام پیش ہوا**

سید معروف شاہ صاحب قبلہ وارثی نے ترتیب دیکر پیش کیا

o

اللّٰھم صل علی محمد و علی آل محمد و بارک وسلم

السلام اے مونس و غمخوار ما — السلام اے دلبر و دلدار ما

السلام اے مردم چشمان ما — خوں شدہ اے دیدۂ گریان من

السلام اے یوسف کنعان من — السلام اے دلبر جانان من

السلام اے جان ما جانان ما — السلام اے دین ما ایمان ما

السلام اے مظہر انوار حق — السلام اے مصدر انوار حق

السلام اے وجہ تسکین روئے تو — السلام اے روح جانم بوئے تو

السلام اے معدن صدق وصفا — السلام اے مخزن علم وحیا

السلام اے جان من قربان تو — ہر دو عالم تابع فرمان تو

السلام اے چشم پر شرم وحیا — سوئے زنداں مے برد زلف دوتا

السلام اے منزل ما کوئے تو — میکشد آں خنجر ابروئے تو

السلام اے ابر رحمت السلام — السلام اے بحر شفقت السلام

السلام اے قوت ادراک ما — السلام اے مرہم تریاق ما

السلام اے ورد تو ما را دوا — خاک پائیت بہر ما خاک شفا

السلام اے وارث عالم پناہ — السلام اے بیکساں را تکیہ گاہ

السلام اے چارۂ بیچارگاں — السلام اے مرہم دل خستگاں

ما کجا او تو کجا ذکرت کجا — اللہ اللہ نسبت شاہ و گدا

وارثا بنما جمال خویش تن — رحم کن بر ما بحق پنجتن

قصۂ معروف غمگیں اے صبا — وارثاں در حضرت سلطان ما

کن فنا در ذات خود مارا تمام

ختم شد ایں قصہ اکنوں والسلام

Dear Sir,

I take great pleasure in answering your question about Warith Aly Shah, and telling you all that I know about him. My meeting with this ascetic was an important event in my life, and it can only be valued by reading the outline of my biography. I love to record it, and when I do so, I feel the fond grasp of gratitude, one of the sweetest divine attributes.

My connection with Warith Aly Shah is the only one between myself and a human being which has not been marred by natural imperfections. He was my dearest human friend and he filled my heart even more completely than my mother. In fact, my greatest wish with regard to her was that she might reach his degree of detachment, and thereby be delivered, after her death, from any limited future existence. He summed up all my feeling, and lived within me as a vague ideal long before the day in which I met him in the outer world. The pure consciousness and the heavenly detachment of which he was an expression, were already on the horizon of my subconscious self when I was thirteen years old, and asked H. H. the Maharaja of Kashmere if there were still any true Yogis in India. I heard of him for the first time in 1902 or 1903, in London. Towards that date, Shiekh Habeeb Ahmed, who came from India, expounded to me some occult speculations of his own, an astrology and philosophy which failed to satisfy me. So the Shiekh told me that if I wanted a higher light I might get it from his Master Warith Aly Shah This name immediately became for me a lovely centre of attraction,a sign of spiritual degree which was more or less consciously my goal at that time.I therefore conceived the firm intention of going to meet the Master. One year before, I had obtained from my parents the permission of spending the winter in Egypt, and I had enjoyed there the solitude which I considered necessary to mediate on divine names, according to a Soufi method which Shiekh Habeeb Ahmed had explained to me. Consequently, I was allowed to go again to

Cairo under the care of Hassan Askari, my Teacher of Arabic I knew that my parents would refuse to let me travel as far as India, so I took my passage secretly up to Bombay, on the *Marmora* of the P.& O., intending to return quickly to Egypt in order that my mother might not be anxious.I rested in Bombay, then in Lucknow, meditating for about seven hours daily in dark room, as it has been my habit to do since one or two years.

From Lucknow, I started for Dewa Sharif in a carriage, together with Hassan Askari, and before noon I was trembling with emotion on the threshold of Warith Aly Shah's house. I had never seen anything like and Indian village and the Fakirs in yellow robes, so the whole place round was transferred, in my mind, the world of sense to a stage above dream-land, where meanings and material objects transmuted into each other. Leaning on two of the followers, the tall ascetic figure of Warith Aly Shah appeared. Blue eyes as deep and transparent as the sky; a very high and straight forehead; regular features; a white complexion and a white beard; the innocent and buoyant smile of early youth. I ran upto him quickly with the daring of rapture, and pressed my head on his heart.He folded me in his arms, and said Mohabat, Mohabat (This is love, love). We sat down on mats. Hassan Askari translated his questions. Where does he come from? What is his religion (Millat)? I gave Askari no answer to this last question because I had none to give. However Warith Aly Shah said something about the unity of aim in all religions which I cannot exactly remember, because my attention was concentrated on the one through which I wanted to express. Askari told him, that I had come to India for the sole purpose of meeting him, not to see any of the famous places or monuments such as the Taj Mahal.Has he any wish? There was the question I expected from him and there was the thought in which I was concentrated.Yes, I said, I wish to be yourself. He smiled , looked round, paused a little before answering and then uttered some Urdu words which were better than all blessing to me 'Ham wa tum wahan eik jagah hounge' ('I and you, there beyond, shall be in the same place'). Like a calm sleep after a long strain, these words produced a quite satisfaction in my heart and mind. It seemed to me that the aim of many yearnings

was entirely attained. I then presented a yellow cloth which Warith Aly Shah put on as a robe, giving me in exchange the grey one which he was wearing.

After that, Aughat Shah, a disciple of the master, led me into the guest-house where I remained half lulled. Then I slept and meditated. In the evening, Aughat Shah, through Askari, told me many things about the Teacher, and related some almost miraculous events of his life, but my attention was not only very keen, because the most interesting words had already been heard by me, never to be forgotten. I can remember that something was said about the early age at which Warith Aly Shah entered the path; I think it was nineteen. I also recollect that Aughat Shah mentioned the well-known Soufi precept: "Die (to the world) before your (physical) death",and that he was acquainted with a method of counting on one's figure, during the practice of divine names, which I used to follow. Later in the evening, a singer called, I think, Muhammedi, came in with two musicians, and sang some mystic songs of love and tears.

Next day we took leave of the master, and I thanked him with poor words, the inanity of which I felt somewhat bitterly.

I returned to Egypt by the same ship, the *Marmoro,* and stayed in Helouman, near Cairo, at the Tewfik Place. I chose this place where I had been the year before because it is surrounded by the desert. My own self was now more closely surrounded by the world's great desert than it had ever been, and my fervour in repeating daily some divine names, for many hours, was increased.

Two or three months later, I had a dream, or more precisely an inward vision. I saw Warith Aly Shah alone looking at me, and holding a large red fruit in his right hand. I tried, in the vision, to recognise what fruit it was. I first said "Tomato" then in German, "Paradiesapfel"(Apple of Paradise). Warith Aly Shah raised his hand and ate one half of the fruit, then presented me with the other half which I took. At the same instant he vanished and Aughat Shah standing before me, said, " The Master is dead ". I sobbed violently

but I was happy, as if I did not know whether I was crying with sorrow or joy. In that state I awoke, or rather passed into sub-conciousness. And I understood that the fruit was his heart, and that he was sharing it with me on the threshold of death. Two days later, a telegram came from Shiekh Habeeb Ahmed, who was in London, saying "The Master is dead" Askari was much impressed by the strangeness of the vision and its coincidence with the telegram. I was not very astonished, but I was awed and greatfull, and it seemed to me that the vision expressed again the blessed Urdu phrase which I had heard at Dewa.

For several years, I kept the grey garment of Warith Aly Shah under my pillow, and always kissed it before going to sleep.

In 1907, I began to acquire a summary, higher knowledge of all things through a Being that dose not belong to the world of sense. The thought of that Being transcending all forms, superceded in my mind the one particulars form of my dearest human friend, Warith Aly Shah. However, I can always find the meaning of his form in my inmost consciousness and nameless self.

I hope, dear Sir, that this answer to the question you put two days ago may be considered complete. It is that I know about the pure ascetic of Dewa Sharif.

Yours sincerely,

Galarza, Viscount of Santa Clara

حیاتِ وارث

مصنّف جناب مرزا محمّد ابراہیم
بیگ صاحب شیدا وارثی لکھنوی